فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۰۵

از جنوری ۱۹۷۰ء تا جون ۱۹۷۰ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شعراء

فہرست مضامینِ معارف

جلد ۱۰۵

از جنوری ۱۹۷۰ء تا جون ۱۹۷۰ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۰۵ ماہ شوال المکرم ۱۳۸۹ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۷۰ء عدد ۱

مضامین

مقالات

ادبیات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کا چھٹا اجلاس ۳۰، ۳۱ دسمبر ۱۹۶۹ء کو دار المصنفین میں منعقد اور کامیابی کے ساتھ ختم ہوا، اعظم گڈھ اس صوبہ کا دور دراز خطہ اور بہت چھوٹا مقام ہے، یہاں بڑے شہروں کی دلچسپیوں کا کوئی سامان نہیں ہے، اس لیے اندیشہ تھا کہ اس اجلاس میں زیادہ اجتماع نہ ہوسکے گا، لیکن ہم کو مسرت ہے کہ دار المصنفین کی کشش اہل علم کو ملک کے گوشہ گوشہ سے کھینچ لائی اور ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور علمی و اسلامی اداروں کے ساٹھ سے اوپر نمایندے اور دوسرے اصحاب علم شریک ہوئے، اجلاس کی صدارت جناب حکیم عبد الحمید صاحب نے فرمائی اور اس کا افتتاح مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے فرمایا، راقم نے استقبالیہ پیش کیا، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے اپنی افتتاحی تقریر میں اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے اصل مقصد و منشا کو بڑی خوبی سے واضح فرمایا، جو بہت پسند کیا گیا، مقالہ خوانی کی مختلف نشستوں میں اسلامیات کے مختلف پہلوؤں پر فاضلانہ مقالات پڑھے گئے، اختتامی تقریر جناب ڈاکٹر عبد العلیم صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے فرمائی اور کانفرنس کے مقصد و منشا کو اپنے نقطۂ نظر سے واضح کیا، ان کی تقریر خیالات کے اعتدال و توازن کی بنا پر ہر خیال کے اہل علم میں پسند کی گئی، آخری دن شب کو عربی مدارس کے نصاب اور طریقۂ تعلیم کی اصلاح پر ایک مذاکرہ ہوا، اس میں متعدد اہل علم اور اساتذہ نے اپنے خیالات ظاہر کیے،

کانفرنس کے سلسلہ میں دار المصنفین کے نوادر اور قلمی نسخوں کی نمائش بھی کی گئی تھی، اس کا افتتاح جناب حکیم عبد الحمید صاحب نے فرمایا، دار المصنفین کا کتبخانہ کتابوں کی تعداد کے لحاظ سے زیادہ بڑا نہیں ہو لیکن مذہب اسلام اور اسلامی تاریخ و ثقافت کی تحقیق پر ایسا کلکشن اور منتخب ذخیرہ دوسرے کتبخانوں میں مشکل سے ملے گا، جس کا اعتراف کانفرنس کے اہل علم شرکاء نے بھی کیا، اس کی مطبوعہ کتابوں میں بھی بہت سی خصوصاً تاریخ، جغرافیہ اور طبقات و تراجم کی کتابیں اب نایاب ہیں، مخطوطات میں بہت سے نسخے اپنی قدامت، تاریخی اہمیت، نایابی اور خطاطی وغیرہ کے لحاظ سے نادر و نایاب ہیں، اس لیے یہ نمائش خاص طور سے اہل علم کی توجہ کا مرکز رہی، علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبد السلام ندوی کی تصانیف کے ان کے قلم کے مسودوں خصوصاً سیرۃ النبی، شعر العجم، سوانح مولانا روم کے مسودوں اور مولانا شبلی کے دوسرے قلمی آثار کو بڑی دلچسپی سے دیکھا گیا، مولانا شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کے نام تمام ہندوستان اور بیرون ہند کے اکابر کے خطوط کے البم سے بھی بڑی دلچسپی لی گئی۔

اس اجتماع کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ندوہ کے ابتدائی دور کی طرح قدیم اور جدید تعلیم کے نمایندے ایک مقصد کے لیے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے اور ان کو آپس میں تبادلۂ خیالات کا موقع ملا، اور دونوں کی راہیں جدا ہونے کے باوجود اسلامیات کی تحقیقات کے بارہ میں ایک نقطۂ اتصال نکل آیا جس پر مولانا سید ابو الحسن علی اور ڈاکٹر عبد العلیم صاحب کی تقریریں شاہد تھیں، یہ اس اجلاس کی بہت بڑی کامیابی اور مولانا شبلی کے خواب کی روشن تعبیر ہے، اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ مولانا سید ابو الحسن علی نے کانفرنس کے آیندہ اجلاس کیلئے دار العلوم ندوۃ العلماء کی طرف سے دعوت دی، کانفرنس کی بیشتر تقریبات شبلی کالج کی عمارت میں انجام پائیں، جو دار المصنفین سے بالکل ملا ہوا ہی، کالج کے پورے اسٹاف نے کانفرنس کے جملہ انتظامات میں بڑی محنت و جانفشانی کی، اور اسکی کامیابی میں اسکا بڑا حصہ ہے، کالج نے مہمانوں کے اعزاز میں ایک پر تکلف عصرانہ بھی دیا، کالج اور دار المصنفین ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں، اس لیے کالج کا شکریہ ادا کرنا خود اپنا شکریہ ادا کرنا ہے،

یہ کانفرنس کی مختصر روداد ہے، مفصل روداد اور خطبۂ صدارت آیندہ مہینہ شائع ہوگا۔

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ مفتی محمد قائم صاحب فرنگی محلی نے انتقال فرمایا، مرحوم درس و تدریس اور فقہ و فتاویٰ میں خانوادۂ فرنگی محل کی آخری یادگار تھے، ایک مدت تک مدرسہ حنفیہ جونپور کے صدر مدرس رہے، مگر ادھر عرصہ سے کبرسنی کے باعث خانہ نشین ہوگئے تھے، چند برسوں سے بالکل معذور ہوگئے تھے، مگر اس حالت میں بھی افتا کا کام جاری تھا، اور مولانا محمد رضا فرنگی محلی ان کی نگرانی میں اسکو انجام دیتے تھے، فقہ کے علاوہ حدیث و رجال پر بھی ان کی وسیع نظر تھی، جس پر ان کی تصنیف معیار الحدیث شاہد ہے، اخلاق و وضعداری میں پرانے بزرگوں کا نمونہ تھے، ان کی وفات سے فرنگی محل کی علم و فضل کی آخری یادگار مٹ گئی۔ والبقاء للہ وحدہ۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

جامعہ ملیہ کی تعمیرات کے نقشہ میں ایک مسجد بھی تھی، اور اس کے لیے پچاس ہزار کی رقم بھی جمع تھی، لیکن مختلف موانع کی بنا پر ابتک اس کی تعمیر کی نوبت نہ آسکی تھی، وفات سے کچھ دنوں پہلے مسجد کی تعمیر کی طرف ڈاکٹر ذاکر صاحب کی بڑی توجہ ہوگئی تھی، اس کا نقشہ بھی تیار ہوگیا تھا، مگر ابھی تعمیر شروع نہیں ہوئی تھی کہ ان کا وقت آخر ہوگیا، ان کی موت نے ارباب جامعہ کو مسجد کی تعمیر کے لیے مستعد کر دیا، چنانچہ اس کی تعمیر شروع ہوگئی ہے، اس کے مصارف کا تخمینہ پانچ لاکھ ہے، جو جامعہ کی مسجد کے لیے کوئی بڑی رقم نہیں ہے، ہم کو امید ہے کہ مسلمان خاص طور سے بڑے تاجر اس کار خیر میں پورا حصہ لیں گے، اور سرمایہ کی کمی کی وجہ سے تعمیر میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہوگی۔ چندہ کی رقم مہتمم تعمیر مسجد جامعہ نگر، جامعہ ملیہ نئی دہلی کے نام بھیجی جائے۔

مقالات

معالم السنن امام خطابی

از ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

شکوک و اعتراضات کے جواب امام ابو سلیمان خطابی نے احادیث کے متعلق اعتراضات و شبہات کے جواب بھی تحریر فرمائے ہیں، جو اہم اور معلومات افزا ہونے کے علاوہ ان کی عالمانہ شان اور دقت نظر کا بھی نمونہ ہیں، اس لیے اس کی چند مثالیں پیش کیجاتی ہیں۔

مانعین زکوٰۃ کے ساتھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے طرز عمل کے بارہ میں طویل بحث کی ہے، اس کے وہ حصے جو اعتراضات اور انکے جواب پر مشتمل ہیں، یہاں درج کیے جاتے ہیں، اردو میں حضرت ابوبکرؓ کی مفصل و مبسوط سوانح عمریاں لکھی جا چکی ہیں، لیکن ان میں یہ مباحث موجود نہیں ہیں۔

اعتراضات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے سے اختلاف کیا مگر آخر میں یہ فرمایا کہ

فلما رأیت ان اللہ قد شرح — جب میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت

صدر ابی بکر فعرفت انه الحق۔ — ابوبکرؓ کے لیے شرح صدر فرمادیا ہے تو میں بھی سمجھ گیا کہ وہی حق ہے (جو حضرت ابوبکرؓ فرما رہے ہیں)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے محض حضرت ابوبکرؓ کی تقلید پر اکتفا کرلیا تھا اور ان کو معصوم اور خطا ولغزش سے مبرا سمجھنے لگے تھے۔

(۲) حضرت ابوبکرؓ پہلے شخص ہیں جنھوں نے مسلمانوں کو کفار سے موسوم کیا، حالانکہ عام مسلمانوں کو اس بارہ میں تامل وتردد تھا۔

(۳) قرآن مجید کی آیت :-

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً	تو ان کے مال میں سے صدقہ لے تاکہ تو
تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا وَصَلِّ	اس کے ذریعہ ان کو پاک اور بابرکت
عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ	بنادے اور ان کو دعا دے، بیشک
(توبہ - ۱۰۴)	تیری دعا ان کے لیے تسکین ہے۔

میں خطاب صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے کیونکہ اس کو ایسی شرطوں سے مقید کیا گیا ہے جو آپ کے سوا کسی دوسرے میں نہیں ہوسکتیں، مثلاً صدقہ دینے والوں کی تطہیر وتزکیہ اور ان کے لیے صلوٰۃ ودعا کرنا صرف آپ ہی کے شایان شان ہے

ان احتمالات کی موجودگی میں حضرت ابوبکرؓ کو مانعین زکوٰۃ کو معذور سمجھنا چاہیے تھا، اور ان کے خلاف تلوار اٹھانے سے باز آجانا چاہیے تھا، انھوں نے ان لوگوں کے ساتھ جو سخت گیری کی وہ انکے سوء خلق اور درشتی طبع وغیرہ کا نتیجہ تھا۔

ان اعتراضات کا جواب یہ ہے :-

(۱) مرتدین کی دو قسمیں تھیں، ایک نے دین سے برگشتہ ہوکر دوبارہ کفر اختیار کرلیا تھا،

ان ہی لوگوں کے متعلق حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا ہے (وکفر من کفر من العرب)۔ ان میں بھی دو طرح کے لوگ تھے، ایک جو مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی کو مانتے تھے، اور نبوت محمدی کے منکر ہوگئے تھے، حضرت ابوبکرؓ نے ان سے جنگ کرکے ان کا قلع قمع کردیا، دوسری قسم میں وہ لوگ تھے جو دین سے منحرف اور شرائع اسلام کے منکر ہوگئے تھے، انھوں نے نماز، زکوٰۃ اور دوسرے اہم ارکان دین ترک کرکے زمانۂ جاہلیت کی روش اختیار کرلی تھی،

ایک جماعت ان لوگوں کی تھی جو نماز و زکوٰۃ میں فرق کرتی تھی، یہ لوگ نماز کے قائل تھے مگر زکوٰۃ کی فرضیت کے منکر تھے اور اس کا ادا کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے، یہ لوگ درحقیقت باغی تھے، لیکن اس نام سے موسوم کیے جانے کے بجائے ان کو بھی مرتدین کے زمرہ میں شامل کرلیا گیا تھا، کیونکہ ٹھیک اسی زمانہ میں جب ارتداد کا سیلاب امڈا تھا، ان لوگوں نے بھی شورش اور بغاوت برپا کردی تھی، اس حیثیت سے ان کی بغاوت کو بھی اس کی ایک شاخ قرار دیکر اس پر ارتداد کا اطلاق کردیا گیا،

مانعین زکوٰۃ میں بعض لوگ زکوٰۃ دینا چاہتے تھے لیکن ان کے لیڈروں نے انھیں روک دیا تھا، جیسے قبیلہ بنی یربوع کے لوگوں نے صدقات جمع کرکے حضرت ابوبکرؓ کے پاس بھیجنا چاہا، لیکن مالک بن نویرہ نے روک دیا اور تمام صدقات ان ہی میں تقسیم کردیے۔ ان ہی مانعین زکوٰۃ کے بارہ میں صحابہ کے درمیان اختلاف پیدا ہوا تھا، خصوصاً حضرت عمرؓ ان سے قتال کے بارے میں سخت متردد تھے، چنانچہ انھوں نے حضرت ابوبکرؓ سے بحث کی اور دلیل میں رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پیش کیا :-

امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ فمن قال لا الہ الا اللہ	مجھے لوگوں سے قتال کا حکم دیا گیا ہے تاآنکہ وہ لا الہ الا اللہ نہ کہدیں، پس جس نے لا الہ الا اللہ کہدیا

فقد عصم نفسه وماله
اس نے اپنی جان ومال کو محفوظ کرلیا،

مگر یہ استدلال محض ظاہر کلام پر مبنی تھا، حضرت عمرؓ نے اس کے تمام پہلوؤں اور معاملہ کی تمام شرطوں اور عواقب پر غور نہیں کیا تھا، جب حضرت ابوبکرؓ نے ان کو بتایا کہ زکوٰۃ حق المال کا نام ہے، اور جان ومال کی عصمت کا معاملہ ان کی ان شرطوں کے پورا کرنے سے متعلق ہے، اور جو حکم دو شرطوں سے معلق ومشروط ہو وہ صرف ایک شرط کے پائے جانے اور دوسری کے مفقود ہونے کی صورت میں پورا نہیں ہو سکتا، حضرت ابوبکرؓ کا دوسرا استدلال نماز پر زکوٰۃ کا قیاس تھا، کیونکہ تارک صلوٰۃ سے قتال پر صحابہ کا اجماع ہے، اس لیے انھوں نے زکوٰۃ کے مختلف فیہ مسئلہ کو نماز کے متفق علیہ مسئلہ پر قیاس کیا، حضرت عمرؓ کا استدلال عموم پر اور حضرت ابوبکرؓ کا قیاس پر مبنی تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قیاس سے عام کی تخصیص ہو سکتی ہے، اور ایک چیز کے بارہ میں وارد ہونے والا خطاب جن چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے، جیسے شرط واستثنا، وغیرہ، ان سب کا ان کی صحت میں بھی اعتبار کیا جائے گا۔

اس لیے جب حضرت عمرؓ پر حضرت ابوبکرؓ کی رائے کی صحت ثابت ہوگئی اور حق وصواب منکشف ہوگیا تو انھوں نے مانعین زکوٰۃ سے جنگ کرنے میں ان کی رائے مان لی۔ ان کے مذکورہ بالا قول کا یہی مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکرؓ کا ایسی دلیل وبرہان کے ذریعہ شرح صدر فرما دیا جس پر نص ودلالت موجود تھی،

(۲) دوسرا اعتراض کرنے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ لوگ دین سے بے بہرہ تھے، ان کی ساری متاع بہتان، افتراء، تکذیب اور اسلاف پر نکتہ چینی ہے، پہلے اعتراض کے ضمن میں مرتدین کی مختلف قسموں کے ضمن میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ ان میں کافر کون لوگ تھے، اور مانعین زکوٰۃ کی حیثیت باغیوں کی تھی، وہیں یہ بھی لکھا جا چکا ہے کہ ان کو مرتدین کے زمرہ میں شامل کیے جانے کی وجہ کیا تھی؟

(۳) رہا آیت میں خطاب کا مسئلہ تو قرآن مجید میں خطاب کی تین صورتیں ہیں:۔

(الف) خطاب عام مثلاً

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ (مائدہ-۶)
اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب تم لوگ نماز کے لیے اٹھو۔

یا مثلاً

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (بقرہ ۱۸۳)
اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا۔

وغیرہ

(ب) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مخصوص خطاب۔ اس طرح کے خطاب میں آپ کی تخصیص اور دوسروں کے شریک نہ ہونے کی مخصوص علامت موجود ہوتی ہے، مثلاً

وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَكَ (اسرائیل-۷۹)
اور کچھ رات جاگتا رہ قرآن کے ساتھ، یہ زیادتی ہے تیرے لیے۔

یا جیسے فرمایا:۔

خَالِصَةً لَكَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ (احزاب ۵۰)
یہ خاص ہے تیرے لیے سوائے سب مسلمانوں کے

(س) تیسری نوعیت کے خطاب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب روئے سخن ہونے کے باوجود آپ کے ساتھ پوری امت اس میں شامل ہوتی ہے، جیسے:۔

أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ (بنی اسرائیل-۷۸)
قائم رکھ نماز کو سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک۔

دوسری جگہ ہے:۔

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ (نحل-۹۸)
سو جب تو پڑھنے لگے قرآن تو پناہ لے اللہ کی شیطان مردود سے۔

یا سلا فرمایا :-

وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ (نساء - ۱۰۱) — اور جب تو ان میں موجود ہو پھر نماز میں کھڑا کرے۔

ظاہر ہے آفتاب ڈھلنے کے وقت ہر مسلمان کے لیے نماز قائم کرنا واجب ہے، اور قرآن پڑھنے والے تمام لوگوں کے لیے استعاذہ کا حکم ہے، اسی طرح جس مسلمان کو بھی دشمنوں سے مقابلہ کی صورت میں نماز فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو، اس کو اسی طرح نماز پڑھنی چاہیے جس طرح نبی اکرم نے پڑھی ہے۔

زیر بحث آیت [خذ من اموالھم صدقة الخ] میں بھی اسی نوعیت کا خطاب ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت کے معاملات کے ذمہ دار کو بھی لوگوں سے صدقہ وصول کرنے میں آپ کے اصول و ہدایات کی پابندی کرنی ہوگی۔

اس طریقۂ خطاب کا فائدہ یہ ہے کہ نبی خدا کی جانب سے داعی اور اس کی مراد و منشا کو لوگوں سے بیان کرنے والا ہوتا ہے، اس لیے اس کو خطاب میں مقدم کر دیا جاتا ہے، تاکہ امت دین کے احکام و شرائع میں اس کے اس طریقہ و منہاج کی پیروی کرے جو اس نے انکے لیے متعین و مقرر کر دیا ہے، اسی مفہوم کی رعایت اس آیت میں بھی کی گئی ہے :-

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (طلاق - ۱) — اے نبی جب تم طلاق دو عورتوں کو تو ان کو طلاق دو ان کی عدت پر۔

آپ کی اہمیت کے پیش نظر مخصوص طور پر آپ سے خطاب ہے، مگر حکم کے عموم کے پیش نظر پوری امت کو اس میں شریک کر دیا گیا ہے، بعض مواقع پر خطاب آپ سے ہوتا ہے لیکن اس سے آپکے بجائے دوسرے لوگ مراد ہوتے ہیں، جیسے :-

فَإِنْ كُنْتَ فِي شَكٍّ مِمَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ فَاسْأَلِ الَّذِينَ يَقْرَءُونَ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكَ لَقَدْ جَاءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ (یونس - ۹۴) — سو اگر تو ہے شک میں اس چیز سے کہ اتاری ہم نے تیری طرف تو پوچھ ان سے جو پڑھتے ہیں کتاب تجھ سے پہلے، بیشک آئی ہے تیرے پاس حق بات تیرے رب سے، سو تو ہرگز مت ہو شک کرنے والا۔

ظاہر ہے کہ نبی پر جو کچھ اتارا گیا ہے اس کے بارہ میں اس کو کبھی کسی طرح کا شک نہیں ہو سکتا۔

رہا صدقہ دینے والے کے لیے دعا اور تطہیر و تزکیہ تو اس میں بھی کوئی اشکال نہیں، اللہ و رسول کی اطاعت کے ذریعہ یہ سب چیزیں حاصل کی جا سکتی ہیں، اور اسی پر کیا موقوف ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اطاعت کے جس کام پر بھی ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے وہ آپ کی وفات سے ختم نہیں ہو سکتا، اس لیے امام اور عاملین صدقہ کو صدقہ دینے والے کے مال میں اضافہ و برکت کی دعا کرنا مسنون و مستحب ہے[۱]، اور اللہ تعالیٰ سے یہ امید رکھنی چاہیے کہ وہ دعا کو قبولیت بخشے گا اور سوال کو مسترد نہیں کرے گا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت زکوٰۃ کی فرضیت تسلیم نہ کرے اور وہ امام کو زکوٰۃ دینے سے انکار کر دے تو کیا اس کو بھی باغی قرار دیا جائے گا، اور اسکے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس زمانہ میں زکوٰۃ کی فرضیت کا منکر بالاتفاق کافر سمجھا جائے گا، اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ کے مانعین زکوٰۃ کو معذور قرار دیے جانے کے باوجود ان سے جو جنگ کی گئی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حق کی ادائیگی کے لیے آمادہ ہو جائیں، انکی خونریزی مقصود نہ تھی۔

ان دونوں جماعتوں میں فرق کرنے کی متعدد وجہیں ہیں، وہ زمانہ عہد نبوت سے قریب تھا،

---

[۱] مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم لکھتے ہیں: "اب بھی ائمہ کے نزدیک مشروع ہے کہ جو شخص صدقہ لائے، امام مسلمین بحیثیت وارث نبی ہونے کے اس کے لیے دعا کرے، البتہ جمہور کے نزدیک لفظ "صلوٰۃ" کا استعمال نہ کرے جو حضور کا مخصوص حق تھا"
(ترجمہ قرآن شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی ص ۳۲۴ - مدینہ پریس)

اس میں احکام نازل اور تبدیل ہو رہے تھے، دوسرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت یہ لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، اور دین کے امور و معاملات سے ناواقف تھے، اس لیے شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گئے تھے اس بنا پر ان کو معذور سمجھا گیا، جیسا کہ خود کلام مجید میں ایسے لوگوں کے لیے یہ رعایت ہے

لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا (مائدہ - ۹۳)

جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے ان پر گناہ نہیں، اس میں جو کچھ پہلے کھا چکے۔

لیکن اس زمانہ میں اسلام کی پوری طرح اشاعت ہو چکی ہے، اور زکوٰۃ کے وجوب کا علم اتنا مشہور ہو چکا ہے کہ عام و خاص اور عالم و جاہل کوئی اس سے بے خبر نہیں رہا، اس لیے اب اس کے انکار کی تاویل کرنے والے کو معذور نہیں سمجھا جائے گا، یہی حال اُن تمام امور دین کا ہے، جن پر امت کا اجماع و اتفاق ہے، اور جو پوری طرح معلوم و مشتہر ہو چکے ہیں، جیسے پنجوقتہ نماز، رمضان کے روزے، جنابت کا غسل، زنا، شراب اور محرمات سے نکاح کی حرمت وغیرہ۔ ان سب کے انکار کرنے والے کا وہی حکم ہوگا، البتہ اگر کوئی نیا نیا مسلمان ہوا ہو اور دین کے حدود وغیرہ سے پوری طرح واقف نہ ہو اور اس ناواقفیت کی وجہ سے کسی چیز کا انکار کر دے تو اس کو کافر نہیں قرار دیا جائے گا، یا جن امور پر اجماع ہو لیکن ان کو عموماً صرف خواص ہی جانتے ہوں جیسے بیوی کی پھوپھی اور خالہ سے نکاح، قاتل عمد کا میراث سے محروم ہونا اور دادی کا چھٹا حصہ وغیرہ تو اس طرح کے احکام کے منکر کی بھی تکفیر نہیں کی جائیگی، بلکہ اس کو معذور قرار دیا جائے گا، کیونکہ اس نے ایسے حکم کا انکار کیا جس کی نہ شہرت ہوئی ہے اور نہ عوام کو ان سے واقفیت ہوئی ہے۔

حدیث کی تاویل میں شکوک و شبہات پیدا ہونے کی وجہ یہ ہوئی ہو کہ حضرت ابوہریرہ رضؓ[1] نے اس کے بعض حصے

---

[1] حضرت ابوہریرہؓ کی روایت یہ ہے:-

عن ابی ھریرۃ قال لما توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(باقی حاشیہ ص ۱۳ پر)

حذف اور بعض کو مختصر کر دیا ہے، کیونکہ اس کو مکمل بیان کرنا اور واقعہ ارتداد کی تفصیل پیش کرنا مقصود نہ تھا، بلکہ وہ صرف حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے مباحثہ کی حکایت اور مانعین زکوٰۃ سے قتال کے بارہ میں ان بزرگوں کے اختلاف و استدلال کی روداد بیان کرنا چاہتے تھے، دوسرے حضرت ابوہریرہؓ نے اس وجہ سے بھی واقعہ کو بعینہ اور حدیث کو مکمل بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ جن لوگوں سے وہ اس کو بیان کر رہے تھے وہ اس کو اور اس کی نوعیت کو اچھی طرح جانتے تھے، اس لیے اس کے بعض حصوں کے حذف و اختصار میں کوئی حرج اور عذر نہیں تھا،

اس کے مقابلہ میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اور حضرت انس بن مالکؓ کی روایتوں میں بعض اضافے مذکور ہیں، امام ابوداؤد نے حضرت انسؓ کی حدیث کتاب الجہاد میں نقل کی ہے اور وہ یہ ہے:

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲)

واستخلف ابوبکر بعدہ وکفر من کفر من العرب قال عمر بن الخطاب لابی بکر رضی اللہ عنھما کیف تقاتل الناس وقد قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ فمن قال لا الہ الا اللہ عصم منی مالہ ونفسہ الا بحقہ وحسابہ علی اللہ فقال ابوبکر رضی اللہ عنہ واللہ لاقاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ فان الزکوٰۃ حق المال واللہ لو منعونی عقالا کانوا یؤدونہ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقاتلتھم علی منعہ فقال عمر بن الخطاب فواللہ ما ھو الا ان رأیت اللہ قد شرح صدر ابی بکر للقتال فعرفت انہ الحق (مسلم ج ۱ ص ۳۸)

کا انتقال ہوا اور حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب کیے گئے اور عرب کے لوگوں میں بعض کافر ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے ان سے کہا آپ کس طرح لوگوں سے جنگ کریں گے جبکہ رسول اللہ نے یہ فرمایا ہے کہ مجھے لوگوں سے قتال کا حکم دیا گیا ہے تا آنکہ وہ لا الہ الا اللہ نہ کہدیں، پس جس نے لا الہ کہدیا اس نے مجھ سے اپنی جان و مال کو محفوظ کر لیا سوائے ان حقوق کے جن میں یہ حرمت ختم ہو جاتی ہے اور اس کا ذمہ اللہ پر ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا بخدا میں نماز و زکوٰۃ میں تفریق کرنے والوں سے جنگ کروں گا کیونکہ زکوٰۃ مال میں خدا کا حق ہے، بخدا اگر ان لوگوں نے اونٹ کے باندھنے والی رسی جس کو وہ رسول اللہ کو دیتے تھے دینے سے انکار کیا تو اس کے روکنے پر بھی میں ان سے جنگ کروں گا، حضرت عمرؓ نے کہا بخدا ذرا بھی یہ حالت اور دلائل وغیرہ

عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرت ان اقاتل الناس حتی یشہدوا ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً عبدہ ورسولہ وان یستقبلوا قبلتنا وان یاکلوا ذبیحتنا وان یصلوا صلاتنا فاذا فعلوا ذٰلک حرمت علینا دماؤہم واموالہم الا بحقہا لہم ما للمسلمین وعلیہم ما علی المسلمین

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے اسوقت تک جنگ کروں جب تک کہ وہ اس بات کی شہادت نہ دیدیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد خدا کے بندے اور رسول ہیں، نیز وہ ہمارے قبلہ کو اختیار اور ہمارے ذبیحے کھانے اور ہماری نمازیں ادا کرنے لگیں، جب لوگ یہ تمام کام کرنے لگیں گے تو ہمارے اوپر انکی جان و مال حرام و ممنوع ہوجائے گا۔ بجز ان صورتوں کے جن میں جان و مال کا ذمہ ختم ہوجاتا ہے انکو وہی حقوق حاصل ہونگے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں اور ان پر وہ ذمہ داریاں بھی عائد ہونگی جو مسلمانوں پر عائد ہیں۔

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث کو جس میں زکوٰۃ کی شرط کا اضافہ ہے، امام بخاری نے اپنی جامع صحیح میں بیان کیا ہے:-

عن ابن عمر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال امرت ان اقاتل الناس حتی یشہدوا ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ ویقیموا الصلوٰۃ ویؤتوا الزکوٰۃ فاذا فعلوا

حضرت ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اسوقت تک جنگ کروں جب تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی اور نماز و زکوٰۃ ادا کرنے لگیں

ذالک عصموا منی دماءہم واموالہم الا بحق اللہ وحسابہم علی اللہ

جب وہ یہ باتیں کرنے لگیں تو اپنی جان اور مال کو مجھ سے محفوظ کرلیں گے، علاوہ اس سزا کے جو اسلام نے (کسی جرم میں) ان پر مقرر کردی ہے اور انکا حساب اللہ کے ذمہ ہوگا۔

(معالم السنن ج ۲ ص ۳ تا ۱۱)

حج کے بیان میں انھوں نے ایک اور اہم اعتراض کا جواب دیا ہے، اس سے ہمارے زمانہ کے منکرین حدیث کی بھی تردید ہوتی ہے،

بعض ناواقفوں اور ملحدوں نے جو رسول اللہ کی حدیثوں پر طعن اور ائمہ محدثین اور رواۃ حدیث سے گستاخی کرنے میں بیباک واقع ہوئے ہیں، یہ اعتراض کیا ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر میں ایک ہی حج کیا تھا تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ آپ نے افراد، قران، تمتع تینوں حج کیے ہوں، اور آپ سے حج کے جو مناسک و احکام مروی ہیں وہ کس طرح مختلف ہوسکتے ہیں، اسی طرح حج کے متعلق مروی تمام حدیثوں کی سندیں کیونکر قوی، جید اور صحیح ہوسکتی ہیں، جبکہ ان میں تناقض و اختلافات موجود ہیں، دراصل ان لوگوں کا مقصد احادیث کا استخفاف اور حاملین و رواۃ حدیث پر طعن و تشنیع ہے، حالانکہ اگر ان میں حسن ذوق، معرفت صحیح اور احادیث میں توفیق و تطبیق کی صلاحیت ہوتی تو وہ اس قسم کے اعتراضات کی جسارت نہ کرتے، امام شافعی نے اپنی کتاب "اختلاف الحدیث" میں اس کا نہایت عمدہ اور تشفی بخش جواب دیا ہے، ان کی جامع اور پُر مغز تحریر کا ملخص یہ ہے:-

عربی زبان کا یہ مشہور اسلوب ہے کہ کسی کام کا حکم دینے والے کی طرف بھی اس کام کی ویسے ہی نسبت کردیجاتی ہے جس طرح خود اس کے کرنے والے کی جانب کی جاتی ہے، مثلاً اگر کسی شخص نے کسی گھر کی تعمیر کا حکم دیا تو کہتے ہیں (بنی فلان دارا) یا امیر و حاکم کسی کو سزا دینے کا

حکم دے تو اس موقع پر کہا جاتا ہے (ضرب الامیر فلانا) حدیث میں بھی ہے کہ

رجم رسول اللہ ماعزا — رسول اللہؐ نے حضرت ماعزؓ کو سنگسار کیا۔

دوسری حدیث میں ہے:

قطع سارق رداء صفوان — رسول اللہؐ نے حضرت صفوانؓ کی چادر چرانے والے کے ہاتھ کاٹ دیئے۔

حالانکہ آپ نے حضرت ماعزؓ کو سنگسار کرنے کا حکم دیا تھا، وہاں آپ موجود بھی نہیں تھے، اسی طرح آپ نے چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا تھا۔ غرض اس کی مثالیں کلام عرب میں بے شمار ہیں، اسی طرح رسول اللہؐ کے بعض صحابہ نے افراد، بعض نے قران اور بعض نے تمتع کیا تھا، مگر ان سب نے مناسک و احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے سیکھے اور معلوم کیے تھے، اس لیے ان کی نسبت آپ کی جانب اس لحاظ سے جائز ہے کہ آپ ہی نے ان کی اجازت اور حکم دیا تھا، اس طرح ہر صحابی کی بات درست اور سب کا بیان ٹھیک تھا،

میرے خیال میں اس کی ایک اور توجیہ بھی ہو سکتی ہے، وہ یہ کہ کچھ صحابہ نے آپ کو صرف "لبیک بحج" کہتے ہوئے سنا ہو، اس لیے انھوں نے یہ بیان کیا کہ آپ نے افراد کیا تھا، اور چونکہ "وعمرۃ" کو انھوں نے نہیں سنا تھا اس لیے اس کو نہیں بیان کیا، جیسے حضرت عائشہؓ، لیکن جن لوگوں نے کچھ اور بھی سنا تھا انھوں نے اس کو بھی بیان کیا، مثلاً حضرت انسؓ، جو فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ کو تو یہ کہتے ہوئے سنا کہ "لبیک بحج وعمرۃ"، اور شہادتوں کی طرح اخبار و احادیث میں بھی اضافے غیر مقبول نہیں ہوتے، اختلاف وتناقض صرف اس صورت میں ہوگا جب اضافہ اور زیادتی سے دوسرے قول کی نفی و تردید ہوتی ہو، لیکن اگر وہ مثبت ہو تو اس میں کسی شک اور تناقض کا سوال ہی نہیں رہتا،

یہ احتمال بھی ہے کہ بیان کرنے والے نے آپ سے جو کچھ سنا اس کی نوعیت دوسروں کو تعلیم و تلقین

کرنے کی رہی ہو، یعنی آپ نے لبیک بحج وعمرۃ کہنے کے باوجود خود افراد ہی کیا ہو،

باقی جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آپ نے تمتع کیا تھا وہ حضرت عائشہؓ کے اس بیان کو کہ آپ نے حج کا احرام باندھا اور حضرت انسؓ کی اس روایت کو کہ من العمرۃ والحج کو تسلیم کرتے ہیں اور بعض دوسری روایتوں سے اس کو مزید محکم بناتے ہیں۔

اس لیے بظاہر مختلف ہونے کے باوجود ان حدیثوں میں کذب کی کوئی آمیزش نہیں اور نہ ان کی تکذیب کی گنجائش ہے، اور ان کے درمیان تطبیق و توفیق نہ صرف ممکن بلکہ بالکل آسان ہے۔[1]

ایک اور اعتراض اور اس کا جواب ملاحظہ ہو:-

مکہ کی حرمت اور فتح کے سلسلہ کی ایک حدیث میں ہے کہ

ان اللہ حبس عن مکۃ الفیل و سلط علیہا رسولہ والمومنین — اللہ نے مکہ سے ہاتھی والوں کو روک دیا اور ان پر اپنے رسول اور مومنین کو مسلط کر دیا۔

اس پر بعض ملاحدہ کا اعتراض یہ ہے کہ "زمانۂ جاہلیت میں تو اللہ تعالیٰ نے ہاتھی والوں سے مکہ کو بچایا لیکن زمانۂ اسلام میں حجاج بن یوسف سے جب اس نے کعبہ میں منجنیق نصب کی، آگ لگائی قتل وخونریزی کی، حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ اور ان کے رفقا کو مسجد کے اندر قتل کیا، نہیں بچایا، اسی طرح قرامطہ کو بھی جنھوں نے کعبہ کو لوٹا، اس کا غلاف اتار لیا، حجر اسود کو توڑ پھوڑا اور اسکو اٹھالے گئے اور علماء حجاج اور نیکوکار مسلمانوں کو کعبہ کے سامنے قتل کیا، نہیں روکا"۔ امام خطابی اس کے جواب میں فرماتے ہیں:-

"بعض علماء نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اصحاب فیل کو روکنا آپ کی نبوت کی علامت اور دلیل کے طور پر تھا، اور آپ کے آبا کی حرمت وعظمت شان کے پیش نظر ایسا کیا گیا تھا، کیونکہ یہ لوگ حرم کے رہنے والے اور کعبہ کو آباد کرنے والے تھے، اس لیے یہ گویا نبوت کی غیبی تائید اور مخالفین نبوت کے لیے ایک حسی دلیل تھی، اگر خانۂ کعبہ کا دفاع نہ کیا گیا ہوتا تو اہل حرم جو مسلمانوں کے آبا و اسلاف تھے،

[1] معالم السنن ج ۲ ص ۱۶۰ تا ۱۶۲

ہلاک ہو جاتے، دوسرے اللہ تعالیٰ کا اس سے خاص مقصد یہ تھا کہ اپنے رسول کی نبوت پر اس سے حجت قائم کردے، اور یہ دراصل ان کے اندر نبوت کے ظہور کی تمہید تھی، چنانچہ اسی سال رسول اللہ صلعم کی ولادت ہوئی، اہل عرب چونکہ جاہل اور علم وحکمت اور بصیرت سے محروم تھے، اس لیے وہ ان ہی باتوں کو جان بوجھ سکتے تھے، جن کا حس ومشاہدہ کے ذریعہ ادراک ہو سکتا ہے، اس بنا پر اگر خانہ کعبہ کو ڈھانے والوں کو نزر کا گیا ہوتا تو ان کے لیے نبوت کے ایسے دلائل وشواہد مہیا نہیں ہو سکتے تھے، جو ان پر پوری حجت بن سکتے، لیکن جب اللہ نے دین کو غالب، اس کا پرچم بلند اور اس کے دلائل واضح کر دیے اور اس کے اعوان وانصار کی تعداد بہت بڑھ گئی، اس وقت خانہ کعبہ کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو دین کے لیے مضر اور مسلمانوں کی بصیرت کے لیے نقصان رساں ہوتی، اور یہ جو کچھ ہوا وہ اللہ کی جانب سے اس کے بندوں کا امتحان تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کے صبر ومجاہدہ کو آزمانے اور ان کو اپنے مزید فضل وکرم اور مغفرت وغیرہ سے نوازنے کے لیے ایسا کیا تھا، اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے خلق وامر دونوں اسکے اختیار میں ہے، وتبارک اللہ رب العالمین۔" (ج ۲ ص ۲۱۹-۲۲۰)

طرز استدلال

معالم السنن میں بحث واستدلال کا انداز نہایت دلکش اور دلنشین ہے، جس سے مسئلہ کی صحیح نوعیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے، اس لیے حسن استدلال کے چند نمونے بھی تحریر کیے جاتے ہیں:

ہزیل بن شرحبیل اودی بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور سلمان بن ربیعہ کے پاس آیا اور اس نے سوال کیا کہ ایک میت کے ورثا میں ایک لڑکی، ایک پوتی اور ایک حقیقی بہن موجود ہیں، ان کے حصے کیا ہوں گے؟ ان لوگوں نے بتایا کہ لڑکی کو نصف اور بہن کو نصف ترکہ ملے گا، اور پوتی کو کچھ نہیں ملے گا، پھر سائل کو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی خدمت میں جانے کے لیے کہا، جب اس شخص نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مسئلہ دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ میں اس کا وہی جواب دوں گا جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے، یعنی بیٹی کو نصف اور ثلثین کی تکمیل

کے لیے ایک حصہ (تہائی) پوتی کو اور باقی ترکہ بہن کو ملے گا۔

امام خطابی اس کی توجیہ وتشریح میں لکھتے ہیں:-

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکیوں کی موجودگی میں بہن عصبہ ہوتی ہے، یہی اکثر صحابہ وتابعین اور عام فقہا کا مسلک ہے۔ صرف حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے اس میں عام صحابہ سے اختلاف کیا ہے، انکا خیال ہے کہ متوفی کے اگر لڑکی اور بہن موجود ہوں تو لڑکی کو نصف اور بہن کو کچھ بھی ترکہ نہیں ملے گا، جب بعض لوگوں نے ان سے عرض کیا کہ حضرت عمرؓ کا فتویٰ اور فیصلہ اسکے خلاف ہے تو انھوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ زیادہ واقف ہے یا یہ لوگ، اس سے اس آیت کی طرف اشارہ تھا:

ان امرؤ ہلک لیس لہ ولد ولہ اخت فلہا نصف ما ترک (نساء)

اگر کوئی آدمی فوت ہو گیا اور اسکے کوئی اولاد نہ ہو اور بہن ہو تو اسکو نصف ترکہ ملیگا،

بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہن کے وارث ہونے کے لیے اولاد کا نہ ہونا شرط ہے، لیکن عام صحابہ نے اس کی تفسیر میں سنت وحدیث کے اس بیان کو پیش نظر رکھا ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ مذکورۂ بالا آیت میں ولد کا اطلاق صرف اولاد ذکور پر کیا جائے گا، لڑکیاں اس میں شامل نہیں ہیں، اور یہ واقعہ ہے کہ ولد کے لفظ سے اول وہلہ میں یہی خیال بھی ہوتا ہے، گو لڑکیوں پر بھی لڑکوں کی طرح اولاد کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے، ہم نے جو بات کہی ہے قرآن مجید میں اس کے متعدد شواہد ونظائر موجود ہیں، مثلاً کفار کا ایک جگہ یہ قول نقل ہوا ہے کہ

لاوتین مالا وولدا (مریم)

مجھکو مل کر رہے گا مال اور اولاد

دوسری جگہ ہے:-

ولن تنفعکم ارحامکم ولا اولادکم (ممتحنہ)

ہرگز کام نہ آئیں گے تمھارے کنبے والے

ایک اور آیت میں ہے:

انما اموالکم واولادکم فتنۃ (توبہ) تمھارے مال اور اولاد ہی ہیں جانچنے کو

ان آیتوں سے بداہتہً یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ولد سے مقصود و مراد اولاد ذکور ہیں اور اولاد اناث مراد نہیں ہیں، یہی عربوں کی مالوف عادت بھی ہے کہ وہ لڑکیوں کی کثرت کو فخر و عزت کا باعث نہیں بلکہ باعث شرم سمجھتے تھے اور انھیں زندہ درگور کر دیتے تھے۔

ولد کے لفظ میں ٹھیک اسی طرح کی تخصیص پائی جاتی ہے جس طرح کی تخصیص مال کے لفظ میں ہے، کیونکہ جب وہ مطلقاً بولا جاتا ہے تو عرف کے اعتبار سے اس سے محض ابل (اونٹ) مراد ہوتے ہیں اور دوسری اقسام کے مال کا اس پر اطلاق نہیں ہوتا۔

پس جب یہ ثابت ہو گیا کہ آیت زیر بحث (ان امرؤ هلك ليس له ولد وله اخت الخ) میں ولد سے صرف اولاد ذکور مراد ہیں، اور لڑکیاں اس میں شامل نہیں ہیں تو بہنوں کو لڑکیوں کی وجہ سے ترکہ سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ (ج ۴ ص ۹۴ و ۹۵)

ایک اور مثال ملاحظہ ہو:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں متعہ کی ممانعت فرمائی ہے، امام خطابی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

"متعہ کی حرمت پر مسلمانوں کا اتفاق ہے، صدر اسلام میں یہ ضرور مباح تھا لیکن حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے اس کو حرام قرار دیدیا، یہ آپ کی زندگی کے آخری دور کا واقعہ ہے، اس لیے اس کے متعلق مسلمانوں کے ائمہ میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا، بجز بعض شیعوں کے جو اس کی اباحت کے قائل ہیں، اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ بھی مضطر اور مجبور کے لیے اس کو تاویلاً مباح قرار دیتے تھے، لیکن بعد میں وہ بھی اس کا فتوی دینے سے باز آ گئے تھے، ان کا خیال تھا کہ اگر کوئی شخص طویل مدت کے لیے وطن سے باہر ہو اور عسرت و مجبوری کی وجہ سے وہاں نکاح کرنا ممکن نہ ہو

تو یہ صورت اختیار کرنے میں مضائقہ نہیں ہے، سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ کے فتوی کا اچھے انداز میں ذکر نہیں کیا جاتا تو انھوں نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا، اور فرمایا کہ خدا کی قسم میرا یہ مطلب نہیں ہے، میں نے متعہ کی حلت کا صرف اس لیے حکم دیا ہے کہ خود اللہ تعالے نے مضطر اور مجبور لوگوں کے لیے اس قسم کی رخصتیں عطا کی ہیں، چنانچہ اضطرار آمردار، سور کا گوشت اور خون کھانا مباح ہے، یہ صورت بھی بعینہ اسی طرح کی ہے"۔

امام خطابی نے اس رائے پر یہ نقد کیا ہے:۔

"حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے نص کے بجائے قیاس پر اعتماد کیا ہے، حالانکہ یہ قیاس صحیح نہیں ہے، کیونکہ زیر بحث مسئلہ میں ضرورت اور اضطرار اس طرح سے متحقق اور ثابت نہیں ہوتے جس طرح مردار وغیرہ کھانے میں ثابت و متحقق ہیں، کیونکہ کھانے پر زندگی کا دار و مدار ہے اور نہ کھانے سے انسان مر جاتا ہے، یہاں تو صرف غلبۂ شہوت کا معاملہ ہے، جس پر قابو پایا جا سکتا ہے، شریعت نے اس کے لیے روزے تجویز کیے ہیں، اور بعض طبی اشیاء کے ذریعہ بھی اس کا تدارک ممکن ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں چیزوں کا حکم ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے"۔ (ج ۳ ص ۱۹۰ و ۱۹۱)

وجوہ و مصالح | شریعت کے احکام و قوانین حکم و مصالح پر مبنی ہیں، چنانچہ خود بعض آیتوں اور حدیثوں میں وجوہ و علل کا ذکر ہوتا ہے اور صحابۂ کرام میں متعدد بزرگوں نے احکام کی مصلحتیں اور حکمتیں بیان کی ہیں، اور ان کے بعد کے لوگوں نے بھی اس کی طرف توجہ کی ہے، امام خطابی کا نام اس حیثیت سے بھی ممتاز ہے، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ شریعت کے اسرار و مصالح پر اپنی بے نظیر کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"صحابہ کے بعد تابعین و تبع تابعین اور علمائے مجتہدین نے بھی شریعت کے احکام کی علتیں اور مصلحتیں بیان کی ہیں، اور ان کے اسرار و وجوہ کو جاننے اور سمجھنے کی کوششیں کی ہیں...... پھر امام غزالی

امام خطابی اور عزالدین بن عبدالسلام وغیرہ نے، اللہ ان کی مساعی قبول فرمائے، بڑے لطیف نکتے
اور عمدہ تحقیقات پیش کیے ہیں۔" (ج ۱ ص ۵)

ذیل میں معالم السنن سے اس کی چند مثالیں درج کیجاتی ہیں:-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

وبالغ فی الاستنشاق — خوب اچھی طرح ناک کی صفائی کرو۔

امام خطابی فرماتے ہیں کہ وضو میں استنشاق کی اس قدر اہمیت اور تاکید اس لیے کی گئی ہو
کہ اس سے قرآن پڑھنے میں مدد اور تلاوت کرنے میں بہت آسانی ہوتی ہے، کیونکہ سانس لینے
کا راستہ جب خوب صاف ہو جاتا ہے اور ناک کی تمام کثافتیں جب زائل ہو جاتی ہیں تو
مخارج اور حروف ٹھیک ٹھیک اور صحیح طور سے ادا ہوتے ہیں۔" (معالم السنن ج ۱ ص ۵۵)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھل کو بدو صلاح
سے پہلے بیچنے سے منع کیا ہے، اس کے باوجود حکم بیان کرتے ہوئے امام خطابی لکھتے ہیں:-
"عموماً پھل بدو صلاح کے بعد آفتوں اور تباہیوں سے محفوظ و مامون رہتا ہے، لیکن
بدو صلاح سے پہلے نرم اور تازہ رہنے اور گٹھلی اور بیج کے سخت نہ ہونے کی وجہ سے اس کو
عوارض و آفات لاحق ہونے کا زیادہ خطرہ رہتا ہے،
بائع کو اس سے منع کرنے کی دو وجہیں ہیں، ایک یہ کہ بدو صلاح کے بعد پھل کی قیمت
اور اس کا منافع بڑھ جاتا ہے، اور اس سے بائع کا مال ضائع نہیں ہوتا، دوسری وجہ یہ کہ
کہ اس سے بائع اپنے مسلمان بھائی کی خیر خواہی کرتا ہے اور اس کے مال کو تباہی سے بچاتا ہے،
مال ضائع ہونے کی صورت میں مشتری نے اگر بائع سے اپنے مال کا مطالبہ کیا تو دونوں کے
درمیان اختلاف برپا ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے، اور اگر وہ ورع و احتیاط کی بنا پر مطالبہ

نہیں کرتا تو بائع کے لیے یہ اکل مال بالباطل ہے، اسی طرح مشتری کو روکنے کا مقصد اس کو دھوکہ
اور خطرہ سے بچانا ہے، کیونکہ عموماً اس قسم کا مال آفات کی وجہ سے تلف ہو جاتا ہے، اس لیے اس
بیع کی ممانعت کی وجہ اموال کی حفاظت اور بیع میں دھوکہ وغیرہ کی کراہت ہے۔" (ج ۳ ص ۸۲)

آگے چل کر بیوع غرر کی مختلف قسموں کا ذکر کرنے کے بعد ان کی ممانعت کا یہ سبب بیان کیا
ہے کہ "اس قسم کی بیع سے منع کرنے کی وجہ مال کو ضائع ہونے سے محفوظ رکھنا اور جھگڑے اور نزاع
کا تدارک ہے۔" (ج ۳ ص ۸۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "غصہ کی حالت میں قاضی کو دو شخصوں کے درمیان
فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔" شیخ نے اس کی حکمت یہ بتائی ہے کہ "غصہ عقل کو تبدیل اور طبیعتوں کا اعتدال
و توازن ختم کر دیتا ہے، اسلیے آپ نے غصہ زائل ہونے تک فیصلہ کرنے میں توقف کرنے کا حکم دیا ہے،
اور جو چیزیں بھی اس قبیل کی ہیں، ان کو بھی اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے، مثلاً سخت بھوک،
شدید خوف اور تکلیف دہ بیماری وغیرہ، اس لیے ان حالتوں میں بھی فیصلہ کرنے سے پرہیز
کرنا چاہیے۔" (ج ۴ ص ۱۶۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "امامت کا سب سے زیادہ مستحق وہ شخص ہے جو
اقرا یعنی کتاب اللہ کو سب سے زیادہ بہتر پڑھنے والا ہو، اس کے بعد اس شخص کا حق ہے جو سب سے زیادہ
سنت سے واقف ہو، اور اس کے بعد ہجرت میں سبقت و قدامت والے کا اور اس کے بعد
زیادہ عمر والے کا درجہ ہے۔" امام خطابی اس ترتیب کی حکمت میں لکھتے ہیں کہ "یہی بالکل ٹھیک
اور صحیح ترتیب ہے، کیونکہ آپ نے امامت کے سب سے مقدم اور بنیادی جز، قرأت کو مقدم قرار دیا ہے،
اس میں ایک خاص نکتہ اور حکمت یہ ہے کہ عرب کے لوگ امی اور ناخواندہ تھے، اس لیے ان کا جو شخص
کچھ بھی قرآن جانتا تھا وہ نہ جاننے والے کے مقابلہ میں امامت کا زیادہ مستحق تھا، کیونکہ نماز بغیر

قرأت کے ہو ہی نہیں سکتی، اور جب قرأت نماز کی اہم ضروریات اور ارکان میں ہے تو اس کو ترتیب میں دوسری خارجی چیزوں پر مقدم ہونا چاہیے، اس کے بعد سنت کا ذکر ہے، جو فقہ وبصیرت اور احکام کے متعلق رسول اللہ صلعم کے ہدایات وضوابط کو جاننے کا نام ہے، کیونکہ اگر امام نماز کے احکام اور اس کے اندر ہونے والی بھول چوک اور کمی بیشی سے ناواقف ہوگا تو اس کو فاسد کردیگا، اس لیے اس کو جاننے والا اور اس میں فقہ وبصیرت رکھنے والا اس کو اور اس کے احکام کو نہ جاننے والے پر مرجح ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ معرفت سنت کا قرأت کے بعد ذکر کیا ہے لیکن فقیہ وعالم بالسنۃ اگر نماز کے جواز کے بقدر قرآن پڑھ سکتا ہو تو وہ ماہر قرأت سے زیادہ امامت کا مستحق ہوگا، اس لیے کہ فقہ واحکام کے علم اور سنت کی معرفت میں اس کا درجہ کمتر ہے۔

قاری کو مقدم اور ترتیب میں پہلے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ عام صحابہ کے اگر حالات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں وہی شخص اقرء ہوتا تھا جو شخص افقہ بھی ہوتا تھا، حضرت ابو مسعودؓ فرماتے ہیں کہ "ہم میں سے جب کوئی شخص ایک سورہ یاد کر لیتا تھا تو جب تک اس سے اچھی طرح واقف اور اس کے حلال وحرام سے پوری طرح باخبر نہیں ہو جاتا تھا اس وقت تک دوسری سورہ نہیں سیکھتا تھا، (او کما قال) البتہ صحابہ کے بعد یہ کیفیت ختم ہو گئی ہے اور اب اکثر لوگ قرآن پڑھ سکتے ہیں مگر اس کو سمجھ نہیں سکتے، اس لیے قرّاء زیادہ اور فقہاء وعلما کم ہوگئے۔

اس کے بعد آپ نے قدیم الہجرۃ شخص کا درجہ قرار دیا ہے، گو اب ہجرت تو موقوف ہو چکی ہے، تاہم اس کی فضیلت کی حیثیت موروثی ہے، اس بنا پر مہاجرین کی اولاد یا وہ جن کے آبا و اسلاف کو ہجرت و اسلام میں شرف وتقدم حاصل تھا، ان لوگوں پر جن کے آبا و اسلاف کو اس قسم کی فضیلت وتقدم حاصل نہیں ہے، ترجیح حاصل ہوگی، اگر ان سب حیثیتوں سے

لوگ مساوی ہوں تو معمر آدمی کو بڑھایا جائے گا، کیونکہ سن وسال کی بڑائی بجائے خود ایک فضیلت ہے، دوسرے اگر کوئی شخص دوسرے لوگوں سے عمر میں زیادہ اور بڑا ہے تو اس کو اسلام میں بھی شرف وتقدم حاصل ہوگا، اس اعتبار سے اس کی حیثیت اُس شخص جیسی ہوگی جسکو ہجرت کے لحاظ سے امتیاز وسبقت حاصل ہے۔" (معالم السنن ج ۱ ص ۱۶۶ تا ۱۶۸)

بعض احکام کے مصالح نہایت دقیق ہوتے ہیں، ان کے متعلق یہ اصولی بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ مقصود شریعت کی پیروی اور اتباع سنت ہے، خواہ اسباب ومصالح معلوم ہوں یا نہ معلوم ہوں، چنانچہ حضرت عمرؓ نے حجر اسود کے بارہ میں فرمایا کہ "میں جانتا ہوں کہ تو محض ایک پتھر ہے، جو نفع ونقصان نہیں پہنچا سکتا، اگر رسول اللہ ﷺ کو میں نے تجھے چومتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں بھی تجھے نہ چومتا"۔

امام خطابی اس ضمن میں لکھتے ہیں:-

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اتباع سنت مقدم وواجب ہے، خواہ احکام کی علتیں معلوم ہوں یا نہ معلوم ہوں، رہا حجر اسود کا معاملہ تو اس کی عظمت واکرام یا برکت وغیرہ کے خیال سے اس کا بوسہ لیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے بعض پتھروں کو بعض سے افضل قرار دیا ہے، جس طرح اس نے بعض مقامات اور شہروں کو یا بعض راتوں، دنوں اور مہینوں کو فضیلت وبرتری عطا کی ہے، اصل چیز تسلیم ورضا ہے، تاہم اس کو عقلاً بالکل محال اور مستبعد بھی نہیں قرار دیا جا سکتا، جیسا کہ بعض حدیثوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حجر اسود کی حیثیت دنیا میں اللہ کے یمین کی ہے، اس لیے اس کو چومنا درحقیقت اللہ تعالیٰ سے ایک طرح کا معاہدہ کرنا ہے جس طرح کہ بادشاہوں سے ان کے مقربین اور مخصوص لوگ مصافحہ یا بیعت وغیرہ کرکے یا خدام وعمال ایک رؤسا اور سرداروں کے ہاتھوں کا بوسہ لیکر معاہدہ کرتے ہیں، اس لیے یہ دراصل تنبیہ وتمثیل ہے۔ واللہ اعلم۔" (ج ۲ ص ۱۹۱-۱۹۲)

(باقی)

عروس البلاد بمبئی کے تاریخی خط وخال

از جناب انور احمد صاحب سیوہاروی

(۳)

مسلم دورِ حکومت | ۱۴۲۹ء میں ملک التجار (ریاست بہمنی کا سپہ سالار) نے جب کوکن کی تسخیر کا قصد کیا اور اس علاقہ پر یلغار کرتے ہوئے ماہم اور سالسٹ پر مسلط ہوگیا تو احمد شاہ والیِ گجرات نے فوراً اس کی دست درازیوں کی سختی کے ساتھ روک تھام کے لیے ایک لشکر روانہ کیا اور ملک التجار کو ماہم سے راہ فرار اختیار کرنا پڑی، وہ وہاں سے شہر تھانہ کی طرف چلا گیا، جہاں اسے زبردست ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑا، اور اس طرح یہ علاقہ دوبارہ سلطان گجرات کی مملکت میں محسوب ہونے لگا۔

علاء الدین خلجی نے رام دیو کو نہ صرف اس کی ساری ریاست لوٹا دی تھی بلکہ نوساری کا علاقہ بھی اس کے سپرد کر دیا تھا، رام دیو کے بعد شنکر دیو، دیوگیری کے تخت پر رونق افروز ہوا، جس نے بادشاہ دہلی کو سالانہ خراج دینے سے انکار کرکے بادشاہ کو چراغ پا کر دیا، جس پر علاء الدین نے ۱۳۱۲ء میں اس پر فوج کشی کرکے اسے قتل کر دیا، اور ہرپال دیو حکمرانی کرنے لگا، اس نے بھی کچھ عرصہ بعد بادشاہ دہلی سے بے وفائی کرکے اپنا تخت وتاج کھو دیا (۱۳۱۸ء)، ہرپال دیو کی نافرمانی، سرکشی اور اس کے عبرت انگیز انجام کے بعد ۱۳۱۸ء میں سلطان قطب الدین مبارک شاہ اول نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ علاقہ بمبئی (ماہم) کو اس کی مملکت میں شامل کر دیا جائے، اور اس خطہ کا

مرکزی شہر تھانہ قرار دیا گیا، اور ماہم میں شاہی فوج کا مستقر قائم کیا گیا۔

دہلی میں تغلق خاندان کے برسر اقتدار آنے کے بعد فیروز شاہ نے ظفر خاں نامی ایک امیر کو گجرات اور شمالی کوکن کا صوبیدار مقرر کرکے روانہ کیا جس نے بعد میں بغاوت کا علم بلند کرکے مملکتِ گجرات کی جداگانہ بنیاد ڈالی اور مظفر شاہ اول کے نام سے حکمرانی کرنے لگا (سنہ ۱۳۹۱ء تا سنہ ۱۴۱۲ء)

ظفر خاں جب اس علاقہ کا ناظم اعلیٰ بن کر آیا تو نوساری اور ماہم میں دو گورنر مقرر تھے، جو عہد خلجی کی یادگار تھے، ان دونوں کو ظفر خاں نے معطل کرکے اپنے معتمد افسروں کا تقرر کیا اور اس طرح سارے علاقہ پر پوری طرح قابض ہوگیا، سلطان احمد شاہ (سنہ ۱۴۱۱-۱۴۴۲ء) کے عہد میں ملک اشرق کو ماہم کا ناظم مقرر کیا گیا جس کا ایک عظیم کارنامہ تاریخی حیثیت کا حامل ہے، اس نے قابل کاشت آراضی کی از سر نو پیمائش کراکے سرکاری آمدنی میں اضافہ کیا، اس عرصہ میں بھیم راج کے بھنڈاری سردار نے علم بغاوت بلند کر دیا، اور ماہم پر قبضہ کر لیا، اسکی بغاوت ابھی فرو بھی نہ ہوئی تھی کہ سلطان احمد شاہ (دکن) نے بھی شمالی کوکن کو فتح کرنے کے لیے فوج روانہ کی، اس خبر نے سلطان گجرات کو برہم کر دیا، چنانچہ اس نے اپنے بیٹے ظفر خاں کو اس کی گوشمالی کے لیے روانہ کیا، دکنی اور گجراتی فوجوں میں آبنائے تھانہ کے قریب تصادم ہوا، دورانِ جنگ میں دکنی فوج کو شہزادہ علاء الدین بہمنی کی کمک پہنچ گئی، اس کے باوجود گجراتی فوج ظفریاب ہوئی، اس لڑائی میں دو ہزار دکنی سپاہ اور دو امیر کام آئے، اور حسن بصری کا بھائی حسین گرفتار کر لیا گیا، اس شکست سے سلطانِ دکن انتقام کی آگ میں جلنے لگا۔

قطب خاں حاکم ماہم کی اچانک وفات کے بعد دکنی فوج بمبئی کے قرب وجوار میں آگئی، اس کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے سلطان گجرات نے دوبارہ اپنے بیٹے ظفر خاں کو روانہ کیا، اس فوج کے ساتھ افتخار الملک تھا، جو جنگجو، بہادر اور تجربہ کار جنرل بھی تھا، اور مخلص الملک (ابن البحر)

کو حکم جاری ہوا کہ وہ جنگی جہازات سے شہزادہ کی مدد کرے، امیرالبحر نے سترہ جنگی جہاز دیے۔ گوگھا
اور کھمبایت کی بندرگاہوں سے لیکر ماہم کے لیے روانہ ہوا، ماہم پہنچنے کے بعد یہ طے پایا کہ شہر تھانہ
پر بیک وقت تری اور خشکی دونوں جانب سے حملہ کیا جائے، اس منصوبہ کے تحت پہلے ملک سہرا
کی سرکردگی میں فوج کا ایک حصہ تھانہ کی سمت روانہ ہوا جس نے تھانہ شہر کے کوتوال کو جنگ
میں تین دن تک مصروف رکھا، اور اس عرصہ میں شہزادہ اور افتخار الملک ماہم سے متواتر
اسے کمک بھیجتے رہے، جس کی وجہ سے کوتوال شہر کی ہمت پست ہوگئی اور اس نے جنگ کو
طول دینے میں اپنی حماقت سمجھی، چنانچہ وہ وہاں سے فرار ہوگیا، اس وقت شہزادہ بذات خود
شہر تھانہ کے مضافات میں ہی موجود تھا، شہر کے کوتوال کے فرار ہونے سے تھانہ پھر سے گجرات
کی تحویل میں چلا گیا، اسی اثناء میں ملک التجار جو موقع کی تاک میں تھا، ماہم پر قابض ہوگیا۔
گجراتی شہزادہ کو اس کی اطلاع ملتے ہی وہ فوج لے کر ماہم کی طرف بڑھا اور اس کا محاصرہ
ڈال کر ملک التجار کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔[1]

اب ہم سلم عہد کو اس منزل پر چھوڑ کر بمبئی کی وجہ تسمیہ پر بحث کریں گے۔

وجہ تسمیہ | بمبئی کے نام کے بارہ میں اختلاف رائے ہے، لفظ "بمبئی" یا "بمبے" یا "ممبئی" (مرہٹی)
کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ اس شہر نے یہ نام کہاں سے پایا؟ بعض مقالہ نویسوں نے لکھا ہے کہ
یہ دو جدا جدا پرتگالی الفاظ کا مرکب ہے، یعنی 'بون' (Buon) بمعنی عمدہ اور "باہیہ"
(Bahia) بندرگاہ سے مشتق ہے، یعنی عمدہ بندرگاہ، جو کثرت استعمال سے بمبئی بن گیا۔[2]
مگر اصول زبان کے لحاظ سے یہ مرکب "بو باہیہ" بنا چاہیے تھا، جبکہ خود پرتگالیوں نے نہ بوباہیہ کہا

[1] Thana Gazetteer XIII Part I. Page: 442
[2] Bombay city Gazetteer Part I. Page: 19

اور نہ "بوم باہیہ" بلکہ بوم بائم (Bombaim) کہا ہے، پرتگالی دستاویزات
میں بھی جن کی رو سے یہ جزائر بادشاہ انگلستان چارلس دوم کی پرتگالی ملکہ کیتھرائن کے جہیز میں
دیے گئے تھے، یہی نام درج ہے۔[1]

فرائر (Frazer) نے ۱۶۷۳ء میں بون بے، اور اوونگٹن (Ovington)
نے ۱۶۸۹ء میں لکھا ہے کہ ابتدا میں یہ جزیرہ بون بے (Boon Bay) کہلاتا تھا، اور
گروز (Grose) نے ۱۷۵۰ء میں بوم بائم (Bom baim) لکھا ہے۔[2]

بعض مقالہ نویسوں کا یہ خیال کہ اس شہر کو یہ نام پرتگالیوں نے ہی عطا کیا ہے،
ایک غلط فہمی پر مبنی ہے، جس کا کوئی تاریخی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا، کرنل ایچ یولے
(Col. H Yule) کا قیاس ہے کہ یہ نام "تانہ - مائمبا" سے مشتق ہے، جو بہر اسیر مشتبہ ہے،
کیونکہ باربوس (۱۵۱۶ء) نے سرکار کوکن کے لیے "تانہ مائمبا" استعمال کیا ہے۔[3]

ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ بمبئی سلطان مبارک شاہ خلجی کے نام کی مناسبت
سے بنا ہے، جس نے جزائر بمبئی کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا تھا، اور اس کا نام مبارکپور
یا مبارک آباد رکھ دیا تھا، لیکن تاریخی تصریحات کی روشنی میں اس کی تصدیق نہیں ہوتی،
بلاشبہہ ۱۳۱۸ء میں سلطان مبارک اول (قطب الدین شاہ) کی فوج ماہم اور سالسٹ
پر ایک قلیل عرصہ کے لیے قابض ہوگئی تھی، مگر تاریخ میں اس کا کہیں حوالہ نظر نہیں آتا کہ
اس نے اس مقام کا کوئی نام بھی رکھا تھا، بلکہ اس دور کے تاریخی حوالوں میں ہر جگہ
اسے ماہم لکھا گیا ہے۔[4]

[1] A short Early History of B'bay. P 33 by P.B. Joshi
[2] Bombay city Gazetteer Part I. P. 19
[3] The imperial Gazetteer of India. Vol III P. 74
[4] The Rise of B'bay by S. M Edwardes

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ نام لفظ "مبارک" سے بنا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ جزیرہ سب سے اول اُن عرب جہاز رانوں نے دریافت کیا تھا جو خلیج فارس کے سوپارہ، چول اور تھانہ کی طرف بحری سفر کرتے تھے[1]۔

"مرأت احمدی" میں مملکت گجرات کی پچیس (۲۵) سرکاروں کا تذکرہ ملتا ہے، جن میں بمبئی بھی ایک "سرکار" تھی۔ اس کو "منبئی" لکھا گیا ہے[2]۔

برگس (Briggs) رقمطراز ہے کہ جزیرہ کا ایک حصہ ماہم کے نام سے موسوم تھا، اور ایک حصہ 'مامبے' کہلاتا تھا، اس لیے غور طلب یہ ہے کہ ماہم اور مائمبو (Maiambu) اور ممبئے (Mumbaye) میں کس قدر مماثلت پائی جاتی ہے، ماہم ہی دراصل پورے جزیرہ کا نام تھا، جہاں سب سے اول مسلمانوں نے ایک عالیشان قلعہ تعمیر کیا تھا، اور جب پرتگالیوں نے اس پر قبضہ کیا تو اس قلعہ میں سرکاری دفاتر کھول دیے، جہاں سالسٹ، ٹرامبے، کلیان اور بھمڑی سے آنے والے جہاز جنگی ادا کرتے تھے[3]۔

ہندوؤں کی ایک کتاب "ممبادیوی مہاتمے" (Mumba Devi Mahata-mye) میں ایک مذہبی روایت کا تذکرہ ہے کہ ممبارکھ نامی ایک دیو ان جزائر پر مسلط تھا، جسے برہما سے بڑی عقیدت تھی، برہما اس کی عبادت سے اس قدر متاثر اور خوش ہوا کہ اس نے ممبارکھ سے اس کی دلی مراد کے متعلق استفسار کیا، اس نے یہ انوکھی آرزو کی کہ اس کو حسب خواہش جاندار کی آنکھوں سے اوجھل ہونے کی قدرت حاصل ہو جائے، اسکی خواہش پر اس کو یہ قوت عطا کی گئی، لیکن اس کے بعد وہ انسانوں کو اذیت دینے کے درپے ہو گیا،

---

[1] Bombay town & Island materials. Part III. P. 644

[2] Mirat-Ahmadi By Ali Md. Khan. Translated by James Bird. P. 110

[3] "Guide To Bombay" by J.M. Maclean. P. 2-3

یہاں تک کہ ممبادیوی نے اس کو ختم کیا، اس ممبادیوی[1] کے نام کی مناسبت سے ان جزائر کو بمبئی یا ممبئی کہنے لگے[2]۔

پرشوتم بال کرشن جوشی رقمطراز ہیں کہ بلاشبہ شہر بمبئی نے ممبادیوی سے یہ نام حاصل کیا، لیکن تحقیق اس امر کی متقاضی ہے کہ آخر یہ لفظ "ممبا" کہاں سے پیدا ہوا؟ جوشی کی رائے میں لفظ "ممبا" مُنگا (Munga) یا موگا (Muga) سے مشتق ہے، یہ نام غالباً اس ماہی گیر (کولی) کا رہا ہوگا جو اول اول اس دور افتادہ علاقہ میں متوطن ہوا تھا، اور اس نے ممبادیوی کے مندر کی بنیاد ڈالی تھی، یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ یہ لفظ امبا بھوانی (Amba Bhavani) (ہندوؤں کی ایک مقدس دیوی) سے بنا ہو، کولیوں میں کالی۔ مہا کالی کی طرح امبا بھی "مہا امبا" کے نام سے معروف ہے، اور "آئی" بمعنی 'ماں' احتراماً تقریباً ہر ہندو دیوی کے نام کے ساتھ لگایا جاتا ہے۔ اس طرح لفظ "ممبئی" (Mumbai) بھی "مہا + امبا + آئی = ممبائی" سے بنا ہے[3]۔ یہ تصریح کسی حد تک قابل قبول ہے، ایسے کئی مقامات ہیں جن کے نام مقامی دیوی کے نام سے منسوب ہیں، مثلاً (۱) وسی (بسین) یہ نام وتسلا دیوی یا وتسا سے مشتق ہے۔ وتسا + آئی = وتسئی، اور کثرت استعمال سے وسی بن گیا۔ (۲) گورئی (سالسٹ میں ایک مقام کا نام۔ گورے گاؤں) گوری + آئی = گورئی۔ (۳) جوگیئی (جوگیشوری): جوگئی + آئی = جوگ آئی = جوگئی۔

---

[1] ممبادیوی کا مندر بوری بندر ریلوے اسٹیشن اور میونسپل کارپوریشن کے دفاتر کے قرب وجوار میں موجود تھا، جو ۱۷۶۶ء میں وہاں سے ہٹا کر پائدھونی (Pydhonie) کے مقام پر بنایا گیا۔ اس مندر کو پانڈورنگ شیوا جی نامی ایک غریب شخص نے تعمیر کرایا تھا اور وہی اسکا پجاری بھی تھا۔" (The Origin of Bombay. P. 46)

[2] Early History of The Town & Island of Bombay. by P.B. Joshi P. 39/40

[3] Short sketch of early history of Bombay. by P.B. Joshi. P. 39-40

ڈی کاسٹرو (De Castro) (۱۵۳۸ء)، اس جزیرہ کو "بوا وڈا" (Boa-Vida)
یعنی Good life (خجستہ حیات) کے نام سے موسوم کرتا ہے، یہ نام اس سبب سے پڑا کہ یہاں
سامان خورد و نوش کی فراوانی تھی[1]، دوسری جگہ اس نے بوم بائم لکھا ہے، اس کی کتاب
۱۵۳۸ء کی تصنیف ہے، ۱۵۳۴ء میں سیاؤ بوٹلھو نے بھی بوم بائم اور بون بائم لکھا ہے،
اس نے ماہم کو مائم (Maym)، مجگاؤں کو Mazaguao اور والکیشور کو
Valequecer لکھا ہے، لیکن لفظ بوم بائم یا بون بائم کی وضاحت نہیں کی ہے،
ڈاکٹر جان فرائر لکھتا ہے کہ "چول سے جب ہم چلتے ہیں تو ساحلی جزائر میں سب سے پہلے
Bombain ملتا ہے"[2]۔
خافی خاں (نظام الملک، پرتگالیوں کی قلعہ بندی کے سلسلے میں اسے "منبی"
(انگریزوں کا تعلقہ) ہی لکھتا ہے[3]۔
اس طویل بحث کی روشنی میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لفظ بمبئی اور ممبا دیوی میں تاریخی
مماثلت ہی در اصل اس عروس البلاد کے نام کا باعث بنی۔

عربوں کی ساحل ہند سے دلچسپی

ظہور اسلام سے صدیوں قبل عرب ہندوستان کے مغربی
ساحل سے روشناس تھے، اور Agatharcides (سنہ ۱۸۰ ق م تا [illegible] ق م)
کے زمانہ میں ساحل ہند کے چند مقامات پر عربوں کی کئی بستیاں موجود تھیں، اور صدیوں
کے تجارتی اور ثقافتی تعلقات کی بنا پر ان عربوں کا اثر و رسوخ اسقدر بڑھ گیا تھا کہ

---
[1] Bombay place-Names & street names. by S.T. Sheppard. P37
[2] The origin of B'bay. Dr. Decunhe. P.44
[3] منتخب اللباب حصہ سوم ص ۳۵۷ مترجمہ: محمود احمد فاروقی۔

یہاں کے نچلے طبقہ کے ہندوؤں نے عربوں کا آبائی مذہب تک اختیار کرنے میں تامل نہیں کیا[1]،
اسلامی دور میں سب سے پہلے عہد فاروقی میں کوکن کے ساحل پر عربوں نے حملہ کیا، دوسری بار
۶۳۶ء میں کھمبایت پر، ۶۳۰ء میں بھڑوچ اور ۷۵۸ء اور ۷۷۶ء میں کاٹھیاواڑ پر
حملے ہوئے، اس زمانہ میں یہاں مسلمانوں کی بڑی تعداد مستقل بود و باش اختیار کر چکی تھی،
اور یہاں کا حکمراں خانوادہ سلہارا ان مسلمانوں پر حد درجہ مہربان تھا، انھیں ہر قسم کی
سیاسی، سماجی اور تجارتی مراعات حاصل تھیں، المسعودی نے اس خاندان کے ایک فیاض
اور رحمدل حکمراں جہانج کی مسلمان دوستی کا تذکرہ کیا ہے۔
بیشتر مسلمان محض تجارتی مقصد کے لیے ان مقامات میں بس گئے تھے، اور صدیوں تک
پُرامن زندگی بسر کرتے رہے، ان میں بعض وہ مسلمان بھی تھے جو اپنے کو اکابر صحابۂ کرام کی
اولاد بتاتے تھے،

سقوط سلطنت گجرات اور پرتگالیوں کا عروج

احمد شاہ سے لیکر بہادر شاہ کے عہد تک جزائر بمبئی (۱۴۱۱ء تا ۱۵۳۴ء)
گجرات میں شامل تھے، مرأۃ احمدی میں ان جزائر کا ذکر ملتا ہے،
۱۴۳۶ء میں علاء الدین بہمنی نے رائری (رائے گڑھ) کے راجہ کو باجگذار بنا کر اس کی
لڑکی سے جو "پری چہرہ" کے نام سے مشہور تھی، شادی کر لی، ۱۴۶۹ء میں بہمنی فوج کے مشہور
سپہ سالار خواجہ محمود گاواں نے دابھول پر قبضہ کر لیا، ۱۴۸۵ء میں ملک احمد نامی نے
احمد نگر میں نظام شاہی مملکت کی بنیاد ڈالی، اور ایک دوسرے امیر نے بیجاپور میں
عادل شاہی خانہ ان کی نظامت کی داغ بیل ڈالی۔
ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے قیام کے وقت حکومت گجرات انتہائی عروج پر تھی،

---
[1] Thana Gazetteer XIII Part I. P. 61

اس لیے اس وسیع و عریض مملکت پر مذکورۂ بالا ریاستوں کی حریصانہ نظریں پڑنا شروع ہوئیں، چنانچہ تین ہی سال کے بعد نظام شاہی نے ڈانڈا، راجپور اور شمالی کوکن کے چند مقامات پر نہایت خاموشی کے ساتھ قبضہ کر لیا، بہادر گیلانی نے سلطنتِ گجرات کی بندرگاہوں پر وقتاً فوقتاً دھاوا بولنا شروع کر دیا، اور کچھ دنوں کے بعد اس نے یاقوت نامی اپنے ایک حبشی غلام کو بیس جنگی جہاز کے ساتھ جزائر بمبئی کی طرف روانہ کیا، جس نے ان پر قبضہ کر لیا، لیکن یہ قبضہ بہت تھوڑے دنوں تک قائم رہا، اور بعد کی ایک لڑائی میں وہ خود مارا گیا۔

محمود شاہ بیگڑہ کے عہد میں پرتگالیوں کا اثر و رسوخ ساحلی مقامات پر بتدریج بڑھ رہا تھا، وہ سلطنت گجرات کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں رہا کرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ انھوں نے ماہم (بمبئی) میں بڑی وحشت پھیلائی اور ان کی چیرہ دستیوں سے ساحلی علاقہ کا امن و امان ختم ہو گیا، اس کی خبر سلطان کے کانوں تک پہنچی تو وہ بنفس نفیس ان کی سرکوبی کے لیے نکلا، مگر وہ ڈھانو تک پہنچا تھا کہ خبر ملی کہ امیر البحر ملک ایاز نے پرتگالیوں کو زبردست شکست دے دی اور ان کا سب سے بڑا جنگی جہاز تباہ کر ڈالا، یہ خبر ملتے ہی سلطان الٹے قدم گجرات لوٹ گیا، اسے کیا معلوم تھا کہ یہ فتح عارضی ہے، چنانچہ سلطان بہادر شاہ کے انتقال کے ساتھ ہی پرتگالی مغربی ساحل کے تمام بندرگاہوں پر قابض ہو گئے، اور ۱۵۷۲ء میں علاقہ گجرات کی اس عظیم المرتبت سلطنت کا خاتمہ ہو گیا، جس نے گجرات کے چپہ چپہ پر اسلامی تہذیب و تمدن کے ایسے نقوش چھوڑے ہیں جو آج بھی ان جلیل القدر حکمرانوں کی عظمت کی نشاندہی کر رہے ہیں، اور انکے عہد کے فن تعمیر میں ہندو مسلم ذوق کے گہرے اثرات انکی مذہبی رواداری ظاہر ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے

کہ اکبر کے حرم میں ایک پرتگالی حسینہ بھی تھی جس نے اپنی قوم کو خصوصی مراعات دلوائی تھی، یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ اکبر کو ہموار کرنے میں روڈولف اقواویرا (Rodolfo Aquaviva) کا بڑا ہاتھ تھا، جسے اکبر نے گوا سے شاہی دربار میں مدعو کیا تھا[1]، ان مراعات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر پرتگالیوں کی دست درازیاں بہت بڑھ گئیں۔

مخدوم شاہ کا مزار

یہاں سے تاریخ بمبئی کے مسلم عہد پر پردہ پڑ جاتا ہے، گو ایک طویل مدت تک یہ علاقہ مسلمان حکمرانوں کے زیر اقتدار رہا، لیکن اس سرزمین کو انھوں نے شاید قابل توجہ نہیں سمجھا، ماہم کو البتہ اپنا فوجی مستقر بنا رکھا تھا، جو جنگ میں کارآمد ثابت ہوتا تھا، اس پورے علاقہ میں صرف ماہم اس دور کی ایک پرانی یادگار مخدوم شاہ فقیہ علی کا مقبرہ باقی ہے، جو لاکھوں آدمیوں کا مرکز عقیدت ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس علاقہ میں مسلمانوں کی حکمرانی برائے نام تھی، اس کے انتظامی اختیارات انھوں نے اپنے مقامی ہندو سرداروں کو دے رکھے تھے، ۱۴۶۴ء کے ایک سنگی کتبہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے جس کی رو سے شہر بھیڑی کے ایک ہندو سردار کو تقسیم آراضی کے حقوق حاصل تھے[2]،

جہاز آخرت

ماہم کے مقبرہ کے علاوہ بمبئی کی پرشکوہ جامع مسجد تعمیری نقطۂ نظر سے قابل دید ہے، یہ مسجد ۱۸۰۲ء (۱۲۱۷ھ) میں تعمیری مراحل سے گزری، اس کا تاریخی نام "جہاز آخرت" رکھا گیا، جس سے اس کی تاریخ نکلتی ہے، ۱۸۳۷ء میں ایک کوکنی رئیس محمد علی اوگھے نے اس کی مرمت اور توسیع کرائی۔

یہ غور طلب بات ہے کہ جنگی نقطۂ نظر سے ایسے اہم ترین جزائر کی طرف مسلمان حکمرانوں نے کیوں توجہ نہ کی، اور غیر اقوام کے لیے ہندوستان میں قدم جمانے میں سہولت پیدا کر دی

---

۱ The Rise of Bombay. Page 59
۲ Thana Gazatteer. Part II Page 441

غالباً اس کی وجہ ان کی بحری قوت کی کمزوری تھی، اور ان کے مقابلہ میں بیرونی قوموں کو بحری برتری حاصل تھی،

دیو پر حملہ

۱۵۰۸ء میں گوا کا گورنر ڈون فرانسسکو ڈی المیڈا (۱) Don Francisco de Almeida) انیس جنگی جہازوں اور سولہ سو فوجیوں کے ساتھ دیو (Diu) کی جانب بڑھا، اس کا مقصد دراصل امیر حسین کے اقتدار کو جسے سلطان مصر نے پرتگالیوں کے استیصال کے لیے ہندوستان کے ساحل پر مقرر کیا تھا، ختم کرنا تھا، اس کے صرف ایک سال قبل ۱۵۰۷ء میں مصری کپتان امیر حسین نے سلطان محمود بیگڑہ کے بحریہ کی مدد سے چول کے مقام پر پرتگالیوں کو زبردست شکست دی تھی، اس لیے پرتگالی سب سے پہلے دابھول کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوئے، دابھول میں مقیم شاہی فوج نے جانبازی سے ان کا مقابلہ کیا، پرتگالیوں کے حوصلے پست ہو رہے تھے کہ المیڈا نے نونو واز پریرا (Nuno Vaz Pereira) کو ایک دوسرے راستے سے دابھول پر فوج کشی کا حکم دیا، اس کا مقصد شہر کی فوج کی توجہ دوسری طرف مبذول کرانا تھا، یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی، پرتگالی شاہی فوج کو شکست دیکر شہر میں داخل ہو گئے، اور اس کو لوٹ کر تباہ کر دیا، یہاں سے ۵ جنوری ۱۵۰۹ء کو بمبئی کا رخ کیا اور ماہم (بمبئی) کی بندرگاہ میں اتر کر اس کو تاراج کیا، ماہم سے نکل کر فروری میں دیو پہنچی، یہاں ملک ایاز اور امیر حسین نے مل کر ان کا مقابلہ کیا، مگر قسمت نے یاوری نہیں کی، امیر حسین سخت زخمی ہوا، اور دیو پر پرتگالیوں نے قبضہ کر لیا، اس قبضہ سے اس کا حوصلہ بہت بڑھ گیا اور ان کو پنپنے کا موقع مل گیا۔

پرتگالی وفد

پرتگالیوں کو ایک محفوظ مقام کی ضرورت تھی، جہاں قلعہ تعمیر کرنا چاہتے تھے، اس مقصد کے لیے ان کا پہلا وفد ۱۵۱۳ء میں سلطان گجرات کے دربار میں حاضر ہوا، اور

دوسرا وفد ۱۵۱۴ء میں، دوسرے وفد نے سلطان سے احمد آباد کے مضافات میں ملاقات کی، اور اپنا مدعا بیان کیا، بادشاہ جزیرۂ ماہم ان کے سپرد کرنے پر آمادہ ہو گیا، مگر یہ پرتگالی وفد دیو کے سوا دوسری جگہ کے لیے راضی نہیں ہوا، ڈی کہنا کی نگاہ میں دیو کی اہمیت تھی، جہاں سے وہ تجارت بھی کر سکتے تھے، اور جنگی اعتبار سے بھی دیو ساحل ہند، بحیرۂ عرب اور خلیج فارس پر نظر رکھنے کے لیے کھڑکی کا کام دیتا تھا، اس لیے یہ دونوں سفارتیں ناکام رہیں۔

پرتگالیوں نے ہندوستان کے مغربی ساحل پر اقتدار بڑھانے کے لیے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ بڑا قابل نفرت تھا، لوٹ مار، دہشت انگیزی اور مکر و فریب انکے مخصوص ہتھیار تھے، حصول مقصد کے لیے انکے نزدیک ہر طریقہ جائز تھا، ان کے دونوں وفد کی ناکامی نے ان کے تیور بدل دیے اور انھوں نے فتنہ انگیزی شروع کر دی،

۱۵۱۶ء میں ڈوم جاؤ ڈی مونوے (Dom Joao de Monoy) آبنائے باندرہ میں اپنی بحری فوج کے ساتھ داخل ہو گیا اور حاکم ماہم کی مختصر سی فوج کو پسپا ہو گئی، اسی سال چول میں پرتگالیوں نے ایک کارخانہ قائم کیا (۱)، اسی درمیان میں بحر احمر سے مسلمانوں کا ایک تجارتی جہاز ماہم کی بندرگاہ میں داخل ہو رہا تھا، جو قیمتی مال تجارت سے لدا ہوا تھا، مونوے کی نیت میں پہلے سے فتور تھا، باراس (Barra (۲)) اس جہاز کو لوٹنے کے بارہ میں لکھتا ہے

"جو نہی اس جہاز نے پرتگالی جنگی جہازوں کو دیکھا، اس کے عملے نے اپنے جہاز کو

---

(۱) Garcia D'orta of Bombay by A. X. Soarec. P.205 Rayjornal

(۲) Thana Gazetteer. Part II P. 449.

کمال عجلت کے ساتھ ماہم کے نزدیک لنگر انداز کردیا، اور اپنی جان بچالی، پرتگالی
جہاز آگے بڑھے اور تمام سامان کو اپنی تحویل میں لیکر چول کی طرف چلدیئے"[۱]

پرتگالی مسلمانوں کے تجارتی جہازوں کی تاک میں رہا کرتے تھے، ۱۵۲۲ء اور ۱۵۲۴ء
کے درمیانی عرصہ میں جزائر بمبئی کے سمندر میں پرتگالی قزاقوں کی ٹولیاں لوٹ مار اور غارتگری
کے لیے گشت لگایا کرتی تھیں، اس زمانہ میں ڈوم ڈورٹ منیزیز (Dom Duaxte de menezes)
گوا کا گورنر تھا، اسی کے اشاروں پر یہ قزاق اپنی سرگرمیاں قائم رکھے ہوئے تھے ۱۵۲۸-۲۹ء
میں لوپ واز (Lop. Vaz) نے چالیس جنگی جہاز اور ایک ہزار پرتگالی سپاہ کو لیکر
سلطان گجرات کے ایک بحری بیڑے کو لوٹ لیا جو چول میں ایک باغی سردار کی سرکوبی کے بعد
واپس جارہا تھا جس کی کمان کمال ملک کے بیٹے علی شاہ کے ہاتھ میں تھی،

باغی مغل شہزادہ

اب آئے دن سلطان گجرات کو پرتگالیوں کی شرارتوں سے سابقہ پڑنے لگا تھا
دوسری طرف وسط ہند میں مغلوں کی حکومت استوار ہوتی جارہی تھی، اور وہ اپنی مملکت
کی توسیع کی فکر میں تھے، اسی زمانہ میں ۱۵۳۳ء میں ایک تیموری باغی شہزادہ محمد زماں مرزا
آگرہ سے فرار ہوکر بہادر شاہ کے دربار میں پناہ گزیں ہوا، یہ شہزادہ کئی مرتبہ علم بغاوت بلند
کرچکا تھا، اور ایک مرتبہ خود ہمایوں کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی، ہمایوں کو جب معلوم ہوا
کہ محمد زماں نے شاہ گجرات کے ملک میں پناہ لی ہے تو اس نے بہادر شاہ کو لکھا کہ وہ شہزادہ
کو اس کے حوالہ کردے، بہادر شاہ نے اس کا نہایت توہین آمیز جواب دیا،

بہادر شاہ اور ہمایوں کے مابین مراسلت

اس واقعہ کے بعد بہادر شاہ اور ہمایوں کے درمیان جو تلخ و تند مراسلت
ہوئی وہ تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے، اس کا مفصل تذکرہ "مراۃ سکندری"

[۱] The Rise of Bombay, P.65

میں موجود ہے، ہمایوں نے بہادر شاہ کو لکھا تھا کہ وہ شہزادہ محمد زماں (جو ہمایوں کا بہنوئی تھا
بابر کی بیٹی معصومہ بیگم اس سے بیاہی گئی تھی) کو دہلی روانہ کردے، یا گجرات سے نکال دے،
بہادر شاہ نے اس کا نہایت سخت جواب دیا، اس کے جواب میں ہمایوں نے لکھا کہ وہ گجرات
پر فوج کشی کرنے پر مجبور ہے، بہادر شاہ نے پھر جواب دیا کہ شہزادہ اس کا دوست ہے اسلیے
اس کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے،[۱]

قرارنامہ بسین

اس مراسلت نے بہادر شاہ کو بڑی نازک صورت میں مبتلا کردیا، ایک طرف
ہمایوں حملہ پر آمادہ تھا، دوسری طرف پرتگالیوں سے اندیشہ تھا، اس لیے بہادر شاہ نے
پرتگالیوں سے صلح کرنے میں مصلحت سمجھی، حالانکہ یہ اس کی فاش غلطی تھی جس نے اس کی
سلطنت کی بنیاد ہلاکر رکھ دی، اور اس کا انجام دیکھنے کے لیے وہ زندہ نہ رہ سکا، غرض
۲۳ دسمبر ۱۵۳۴ء کو قرارنامہ بسین (Treaty of Bassein) پر دونوں
کے دستخط ہوگئے،[۲]

اس صلح نامہ کی رو سے بہادر شاہ شہر بسین، ماہم، بمبئی، دیو وغیرہ سے پرتگالیوں
کے حق میں ہمیشہ کے لیے دستبردار ہوگیا، اس طرح پرتگالیوں کی دیو میں قلعہ تعمیر کرنے
کی دیرینہ آرزو پوری ہوگئی، درحقیقت عہدنامۂ بسین گجرات کی عظیم الشان سلطنت
کے تابوت میں آخری کیل تھی۔

پرتگالیوں کی ناقص نظامت

اتنے بڑے وسیع علاقہ پر قابض ہونے کے بعد پرتگالیوں نے اس کے
انتظامی امور میں مطلق دلچسپی نہیں لی، گویا اس علاقہ سے ان کو کوئی سروکار نہیں تھا، اصل
میں جو پرتگالی ہندوستان میں تھے، وہ نظام حکمرانی سے بالکل نابلد تھے، ان میں اکثریت
سپاہیوں اور تاجروں کی تھی، جن کا آداب نظامت سے کوئی تعلق نہیں تھا، چنانچہ انھوں نے

[۱] History of Gujrat, by M. S. Commissariat. P. 348-49
[۲] ایضاً

جزائر بمبئی کو چند جاگیروں میں تقسیم کرکے اپنے ہم مذہبوں کی کاشتکاری میں دیدیا، ان کا سب سے بڑا مقصد اپنے مذہب کی توسیع تھا، اس کو واسکوڈی گاما نے اپنے اس تاریخی جملہ میں واضح کیا تھا۔

VIMOS buscAR CHRistaos-e-ESPECIARIA

(ہم عیسائیت کی توسیع واشاعت اور مسالوں کی تلاش میں یہاں آئے ہیں)[1]

جزائر بمبئی کی تقسیم پرتگالیوں کے زمانہ میں مندرجہ ذیل تھی :-

(۱) جزیرہ بمبئی :- مسٹر ڈیگو نامی عیسائی کو ۸۵ روپیہ سالانہ ٹھیکہ پر دیا گیا تھا،

(۲) ماہم :- ایک دوسرے عیسائی کو ٹھیکہ پر دیا گیا تھا،

(۳) مانڈولی اور مجگاؤں :- یہ بھی ایک عیسائی کو ٹھیکہ پر دیے گئے تھے۔

(۴) قصبات پریل، وڈالا، شیو، اور ورلی منوئیل سیراؤ نامی عیسائی کو صرف ۱۵۴ روپیہ پر دیے گئے تھے۔

(۵) ٹرامبے، چیمبور : جاؤ پرنز کی تحویل میں تھے۔[2]

پرتگالیوں کے ابتدائی دور میں ہیئت بنشیہ (بمبئی) سات قصبات پر مشتمل تھا، (۱) ماہم (۲) پریل (۳) وڈالا (وارلیا) (۴) شیو۔ یہ تمام قصبہ ماہم اور مجگاؤں کے زیر انتظام تھے، بمبئی اور وریل (ورلی) قصبۂ بمبئی کی نظامت میں تھے، ان کے علاوہ مختلف چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں، مثلاً جزیرہ قلابہ، نائیگاوں، ڈونگری، ان میں قصبۂ بمبئی نسبتاً کم آباد تھا، سولہویں صدی کے نصف آخر میں یہاں چند پرتگالیوں کے

[1] The Gazetteer of B'bay City & Island Vol II P. 36/37

[2] Gazetteer of Bombay Vol II P. 31/32

گھرانے اور چند مقامی خاندان مقیم تھے۔[1] یہ مقامی باشندے غالباً کولیوں (ماہی گیر) اور بھنڈاریوں پر مشتمل تھے، مسلمانوں کی آبادی صرف ماہم میں تھی، جن کے بابت گارشیہ ڈا اورتا لکھتا ہے :-

"مسلمانوں نے سب سے پہلے یہاں قدم رکھا، انھیں "نائط" (Noitias) کہا جاتا ہے، یہ غیر ملک سے ترک سکونت کرکے یہاں آباد ہوگئے"[2]

یہ دراصل کوکنی مسلمان تھے، جن کے آباء و اجداد صدیوں سے ساحل ہند پر آباد تھے، نوائط نے حجاج بن یوسف کے زمانہ میں یہاں سکونت اختیار کی تھی، مسلمانوں کے علاوہ کنبی (Kumbi) اور آگری (Agari) بھی آباد تھے، جن کا پیشہ زراعت تھا۔ بھنڈاری، راجہ بھیم دیو کے ساتھ بمبئی آئے تھے، ان کے علاوہ پربھو، ماہم، بمبئی اور پریل میں بھی بس گئے تھے، بنیا، پارسی اور اچھوت بھی تھے،

عیسائیت کی تبلیغ

جزائر بمبئی، تھانہ اور بسین پر تسلط قائم ہونے کے بعد پرتگالیوں نے مذہبی مہم میں سرگرمی شروع کردی، صرف بسین، تھانہ وغیرہ میں دس ہزار باشندوں کو جبراً عیسائی بنایا گیا، اور جو رقم (۵ ہزار لارن سالانہ) معاہدہ بسین کی رو سے مسلمانوں کی مساجد کی مرمت وغیرہ پر خرچ کے لیے طے ہوئی تھی، وہ بند کردی گئی اور بسین اور بمبئی کے کلیساؤں پر صرف کیجانے لگی، ایک عالیشان چرچ ماہم (سینٹ مائکل) لیڈی جمشید جی روڈ کے شمالی سرے پر تعمیر کیا گیا، یہ گرجا پرتگالیوں کی بمبئی میں سب سے پہلی عبادت گاہ تھی۔[3]

پرتگالیوں کی تبلیغی سرگرمیوں نے یہاں کے غیر عیسائی باشندوں کی زندگی دشوار کردی

[1] The Rise of B'bay. P. 72-73 [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۵،

فرانسسکن مشن کے بعد ۱۵۴۲ء میں جیسوٹ مشن (Jesuit Misson) وارد ہوا، جس کی بنیاد ۲۷ ستمبر ۱۵۴۰ء کو رکھی گئی تھی۔[1] اس مشن کا قابل ذکر رکن سینٹ فرانسس زویئر تھا، جسے شاہ پرتگال جاو سوم (Joao III) نے ہندوستان اور مشرقی ایشیا، میں تبلیغی کام کے لیے نامزد کیا تھا۔[2] دونوں مشنوں کے مبلغین ایک دوسرے پر سبقت لیجانا چاہتے تھے، چنانچہ سینٹ انڈریو (St Andrew) (باندرہ، چرچ آف سیو اور آور لیڈی آف سالویشن (Our Lady of Salvation) (دادر) جبری ہم کی یادگاریں ہیں، ۱۵۸۵ء میں فرانسسکی مشن نے منڈاپیشور (دہیسر)، ماہم بمبئی، کرنجا اور آگاشی کے چرچ اپنی تحویل میں لے لیے، جہاں ان کے سرکاری پادری مستقلاً مقیم ہو گئے،[3] انھیں وہ اپنی زبان میں (O Paidos Christaos) کہتے تھے،

صرف مجگاوں کا جزیرہ ایسا تھا، جہاں دونوں مشنوں کے پادریوں میں سے کسی نے مداخلت نہیں کی تھی، یہ جزیرہ ایک سند (۱۸ جنوری ۱۵۷۲ء) کی رو سے ڈی سوزا نامی گھرانے کو انعام میں ملا تھا، ایک دوسری سند (۳ جون ۱۶۳۷ء) میں رے ڈی سوزا کو اس جزیرہ کا مالک تسلیم کیا گیا تھا، اس کے علاوہ دوسرے دیہات جیسوٹ اور فرانسسکن مشن کے زیر انتظام تھے، جہاں عیسائی مبلغین مطلق العنانی کے ساتھ حکمرانی کر رہے تھے، جیسوٹ مشن کی ایک باقاعدہ مسلح فوج بھی تھی، جس نے یہاں کے غیر عیسائی باشندوں پر ظلم و استبداد کی انتہا کر دی تھی، ہندوؤں کے مندر اور مسلمانوں کی مسجدیں مسمار اور جبری تبدیل مذہب کرنا ان کا معمول بن گیا تھا،[4] اسلیے کئی غیر عیسائی خاندان یہاں سے ترک سکونت

[1] History of Mission in India by Julius Richter. P. 45 [2] ایضاً ص ۴۶
[3] Rise of Bombay P. 77 [4] ایضاً ص ۷۹ [5] ایڈورڈ نے اپنی تصنیف میں جیسوٹ فادر
(باقی حاشیہ ص ۴۳ پر)

کر کے بمبئی سے باہر بس گئے، جیسوٹ مشن کی بدسلوکی اور سختی سے خود گوا کا آرچ بشپ بھی نالاں تھا، چنانچہ اس نے شاہ پرتگال کو ایک مراسلہ (۱۶۲۹ء) میں لکھا تھا،

"...... پرتگالی سرکار کے سب سے زیادہ خطرناک دشمن خود پرتگال کے ہی باشندے ہیں، اور ہمارے اندرونی دشمنوں میں جیسوٹ مشن کے مبلغین ہماری حکمرانی کو نہ صرف بدنام کر رہے ہیں، بلکہ وہ بے انتہا نقصان کا باعث بنے ہوئے ہیں"[1]

۱۶۳۱ء میں گوا کے وائسرائے نے بھی ان کی شکایت کی تھی کہ یہ درپردہ مطلق العنان بنتے جا رہے ہیں۔[2]

(باقی)

(بقیہ حاشیہ ص ۴۲) فرانسسکو ڈسوزا کی کتاب Oriente Conquistado کے حوالہ سے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ:- ملیبار کے مسلمانوں کے دو جہاز بندگاہ چول کے قریب سے گزر رہے تھے، فرنانڈو ڈی کاسٹرو، کپتان چول نے فوراً ان کے تعاقب میں ماتھیو گومیڈے (Matheos Gomede) کو روانہ کیا، جو ایک جہاز کو مع اس کے عملہ اور تیئیس ۲۳ مسافروں کے حراست میں لیکر چول کے بندرگاہ میں لے آیا، کچھ قیدی قتل کر دیے گئے، چند نہایت کسمپرسی کی حالت میں جاں بحق ہو گئے، جہاز کا کپتان اور چند قیدیوں نے عیسائیت قبول کر لی اور عمر بھر حضرت مسیحؑ کے سچے اور جاں نثار سپاہی بنے رہے۔" (ص ۷۹)

(حواشی صفحہ ہذا) [1] The Rise of B bay. Page 79-80 [2] ایضاً

محمد ظہیر الدین محمد بابر کا علمی ذوق

از

جناب مولوی محمد حفیظ اللہ صاحب پھلواروی

لودھی خاندان کے بعد برِ اعظم پاک و ہند کی عنانِ حکومت "مغلیہ خاندان" میں آئی، ظہیر الدین محمد بابر اس خاندان کا بانی تھا، بابر کی فتوحات نے اسکو تاریخ میں ایک عظیم فاتح، ایک عظیم جنرل، اور ایک جانباز کشور کشا کی حیثیت سے پیش کیا،

گلبدن بیگم بنت بابر شاہ کے بیان کے مطابق حضرت صاحب قرآنی (تیمور) سے لیکر فردوس مکانی کے زمانہ تک سلاطینِ ماضی میں سے کوئی بادشاہ بھی ایسا نہیں جس نے اتنی محنت کی ہو جتنی کہ میرے والد بزرگوار نے کی، یہ بابر کا تنہا عزم تھا جس نے سیکڑوں سال کی تاریخ بدل ڈالی، اور ایک عظیم سلطنت کی بنیاد رکھدی، (ہمایوں نامہ)

بابر نہ صرف ایک عدیم المثال سپاہی، عظیم المرتبت فاتح اور اولوالعزم بادشاہ تھا، بلکہ اہلِ علم نے اس کو ایک بلند پایہ اہل قلم اور قابلِ قدر شاعر بھی تسلیم کیا ہے، (بزم تیموریہ)

ابتدائی تعلیم: اگرچہ بابر صرف گیارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا تھا، اور اس کے بعد اسے کبھی اتنی فراغت نہیں ملی کہ وہ تحصیل علم و فن کی طرف متوجہ ہو سکتا لیکن اس کے باوجود مورخین کے لئے یہ باعثِ حیرت ہے کہ وہ کیسی ابتدائی تعلیم و تربیت تھی جس نے اس کو ترکی و فارسی کا ایک اعلیٰ پایہ کا ادیب و شاعر بنا دیا،

یہ ذوق بابر کو ورثہ میں ملا تھا، علم دوست باپ، شیخ مرزا نے اس کی تعلیم کے لئے شیخ مزید بیگ، بابا قلی علی خدائی بیدی بیگ، اور مولانا قاضی عبد اللہ جیسے متبحر علما کو منتخب کیا جن کی صحبت نے بابر کی وہ فطری صلاحتیں جو علم و ادب کی طرف راغب تھیں، اجاگر کر دیں، (بزم تیموریہ و اسلامی کتب خانے)

صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے الفاظ میں بابر سال بھر کسی مقام پر چین سے نہیں بیٹھا، علم و کمال سے کچھ ازلی مناسبت تھی، مبدأ فیاض سے ذوق سلیم عطا ہوا تھا، ان ملکی ترددات و انتشارات میں بھی علم کی طرف ایک خاص توجہ رہی، ابتدائی زمانہ میں بہت کم فراغت حاصل ہوئی جو طالب علمانہ تحصیل علم کرتا لیکن متواتر توجہ نے اُس کے واسطے علمی شان بھی حاصل کر لی (تذکرۂ بابر)

ولیم ارسکن لکھتا ہے کہ "بابر اہلِ علم پر نوازش کرتا تھا، اور انہیں ساتھ رکھتا تھا، اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ اسے علم سے دلچسپی تھی، لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ بچپن سے جوانی تک اور جوانی سے موت تک برابر مصروف کار رہا، ہمیشہ کسی نہ کسی معرکہ میں رہتا، اور ایک سال سے زیادہ کبھی کسی مقام پر نہیں ٹھہرا، ایسی ہنگامہ خیز زندگی میں بھی اُس نے اس کا وقت نکال لیا کہ اس دور کے تمام علوم و فنون کو حاصل کر سکا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ذہن تعلیم کی طرف کس قدر مائل تھا،

بابر کی ابتدائی تعلیم کے سلسلہ میں لین پول کا خیال ہے کہ "پانچ سال کی عمر میں اس بچہ (بابر) کو سمرقند لے جایا گیا تھا، اگلے چھ سال اس نے وہاں تعلیم حاصل کرنے میں گزارے ہوں گے، اور پوری تعلیم حاصل کرلی ہوگی، کیونکہ اسکے بعد اسکو اپنی علمی صلاحیت بڑھانے کی فرصت نہیں ملی، دو زبانوں میں اسکی کامل استعداد جو اسکی تحریروں سے ظاہر ہے، بتاتی ہے کہ علم کو حاصل کرنے میں اس نے استقلال کے ساتھ محنت کی ہوگی، اوائل عمر میں اسکی تربیت کیونکر ہوئی اسکا ہمیں علم نہیں، لیکن اس کی تعلیم میں اسکے خاندان کی عورتوں کا کافی دخل رہا ہوگا۔

ہیرالڈ لیم بابر کے ابتدائی انیس سال کے حالات کے سلسلے میں اپنی کتاب "بابر شیر ببر" (Babur the Tiger) میں لکھتا ہے کہ بابر اپنی تعلیم کی پوری کرنے سے غافل نہیں رہا"

پہاڑوں پر جاتے وقت بھی اپنی دل پسند کتابیں ساتھ لے جاتا تھا، اپنے سادہ اور سپاہیانہ افکار کو کبھی کبھی اشعار کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتا تھا. ترکی زبان میں بھی جو عوام کی بولی تھی، اور فارسی میں بھی جو خواص کی زبان تھی۔ اس کا کوئی ندیم عشق و محبت یا عورتوں کے بارے میں گفتگو نہیں کرتا تھا۔

بابر سن شعور کو پہنچا تو آبائی مملکت کو علوم و فنون کا گہوارہ پایا، سمرقند، فرغانہ، خراسان اور خصوصاً شہر ہرات فضل و کمال کے مرکز تھے۔ بابر نے ان مقامات کے علماء اور شعراء سے بالواسطہ اور بلاواسطہ کسی نہ کسی طرح استفادہ ضرور کیا۔ (بزم تیموریہ)

صبح کے وقت بابر ہرات کی عمارتوں، مدارس، مقابر، خانقاہوں اور رصدگاہوں کی سیر اور تحقیقات کرتا تھا، اس کے شوق کا اصل مرجع صاحبانِ علم و فن یا وہ درویش تھے جنھیں ان کی سیاحت کے دوران اپنا مہمان بناتا تھا، یا عمدہ حافظے کے لوگ جنھیں جنی کی روایات ازبر تھیں، اور آخر میں "علوم دنیا" کے جاننے والے۔ غرض بابر ہمیشہ اہل علم و فضل کی صحبتوں میں زندگی گذارنے کا شائق رہا۔ (بابر شیر ببر)

علمی قابلیت اور تصنیف و تالیف

بابر کی مادری زبان ترکی تھی، لیکن عربی اور فارسی زبانوں پر بھی عبور رکھتا تھا، جغرافیہ، تاریخ اور فلکیات سے بھی دلچسپی تھی، نباتات کا ماہر تھا، ادیب و صاحب قلم اور متعدد کتابوں کا مصنف تھا، ارسکن کے بیان کے مطابق اس نے ترکی زبان میں کتابیں لکھ کر اس کا پایہ بلند کر دیا،

بابر صاحب علم اور علم دوست بادشاہ تھا، فقہ، انشاء، اور فارسی و ترکی شاعری میں اسے بڑی مہارت حاصل تھی، ترکی زبان میں اس نے اپنی سوانح عمری لکھی جو اسکی یادگار ہے،

(خافی خاں۔ منتخب اللباب)

فقہ حنفی میں بابر کی مہارت کے متعلق فرشتہ کا بیان ہے کہ وہ مجتہدانہ صلاحیت رکھتا تھا، بابر خواجہ عبید اللہ احراری کا مرید تھا، اور علم معقول اور منقول میں خراسان کے شیخ الاسلام مولانا سیف الدین احمد، علم کلام میں ملا شیخ حسن اور حدیث میں میر جمال الدین محدث کا قدردان اور معترف رہا۔ (ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر)

بابر ترکی زبان کا بلند پایہ صاحب دیوان شاعر تھا، تاریخ رشیدی کا مؤلف مرزا حیدر لکھتا ہے کہ "امیر علی شیر بیگ نوائی کے سوا ترکی شاعری میں کوئی بابر کا ہمسر نہ تھا"، فرشتہ کا بیان ہے کہ" بابر علم موسیقی اور شاعری، علم املا اور انشا میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا، اپنے عہد کے واقعات ایسی شستہ اور فصیح ترکی زبان میں لکھے ہیں کہ اس زبان کے بڑے بڑے ماہرین نے اس کی انشا پردازی کا لوہا مان لیا"۔

ادیب الملک نواب سید نصیر حسین خیال فرماتے ہیں کہ" بابر تلوار ہی کا دھنی نہیں، بلکہ قلم و زبان کا دھنی بھی تھا، ادب و شاعری اس کی فطرت میں تھی، جب دیس سے نکالا ہوا اور تاشقند پہنچا تو وہاں شکار اور شاعری ہی اس کے دو بہترین مصاحب تھے، کوہ و بیابان میں تیر و تفنگ چلاتا اور آب رواں کے کنارے میٹھا غزلوں سے جی بہلاتا، ایسی پرجوش طبیعت پر اس چمن کی سیر ایک اور تازیانہ تھی، وہ سودا یہاں اور بڑھا اور اپنے پرانے مشغلہ کو ہمیشہ تازہ کرتا رہا"۔ (مغل اردو)

بابر اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ" ذی الحجہ ۹۳۳ھ میں دیوان مرتب کیا، اُس وقت تک میں نے چار مختلف اوزان میں پانچ سو شعر کہے ہیں"۔

اپنے تاثرات کا اظہار فارسی اشعار میں بھی کرتا تھا، مگر ان کی تعداد بہت کم ہے، تاہم جس قدر بھی ہے ان کو اساتذہ نے نگاہ تحسین سے دیکھا، بابر کی فارسی شاعری کے متعلق

ابوالفضل کی رائے ہے کہ " بزبان فارسی نیز اشعار دلپسند بردارد "۔

نثر کے ایک متین و دلنشین طرز کا موجد ہے اور علم اصول قانون پر ایک مفید رسالہ لکھا ہے
فن عروض میں بھی ماہر تھا، ترکی کا ایک ایسا شعر کہا ہے جس کی چار پانچ اوزان میں تقطیع
ہو سکتی ہے۔ اس نے علم عروض پر ایک کتاب " مفصل " کے نام سے لکھی تھی"۔ (تذکرہ بابر)

بابر فطری طور پر مذہبی واقع ہوا تھا، اس نے ترکی میں اپنے لڑکے کامران کے لیے ایک
مثنوی " مبین " لکھی جس میں مذہبی، فقہی اور اخلاقی مسائل پر دو ہزار اشعار ہیں، یہ کتاب
" فقہ بابری " کے نام سے مشہور ہے۔

ہیرالڈ لیم کا بیان ہے کہ اس نے ترکی زبان میں عقائد و اعمال کے علاوہ حکمرانوں کے
مالی مسائل پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، مثنوی کی طرز مولانا رومی اور صوفی شعراء
سے لی ہے۔ فلسفیانہ افکار اور پند و موعظت کو نظم لطیف کے قالب میں ڈھال دیا ہے،
اس کے ایک حصہ کا ترجمہ روسی زبان میں کیا گیا ہے،

بابر نے خواجہ عبید اللہ احراری کے مشہور رسالہ " والدیہ " کو بھی نظم کیا ہے،

بابر کی سب سے اہم تصنیف " تزک بابری " ہے، جو علمی دنیا میں بہت مشہور ہے۔ بقول
فرشتہ " بنوعی نوشتہ کہ فصحا قبول دارند "۔

مسٹر بیل کے بیان کے مطابق تمام عالم نے اس کی تعریف کی ہے، اور بقول ہنری لیسٹ
یہ اُن سوانح عمریوں میں ہے جو سب سے اچھی اور سب سے سچی لکھی جا سکتی ہیں۔ ارسکن کہتا ہے کہ
تزک بابری کا طرز نگارش نہایت سیدھا سادہ مگر جاندار ہے، بیورج کا بیان ہے کہ " اس کی
سوانح حیات دنیا کے گراں قدر تاریخی ریکارڈس میں نمایاں حیثیت کی حامل ہے، اڈورڈ ڈاسن
کہتا ہے کہ وہ سینٹ اگسٹائن اور روسو کے خود نوشت اعترافات (Confession)

اور گبن اور نیوٹن کی حیات (Memoirs) کے ہم پلہ ہے۔ کنگ کے قول کے مطابق
تزک بابری مشرقی سوانح حیات میں اپنا ثانی نہیں رکھتی، اور الیٹ ڈاؤسن کے بیان کے
مطابق اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہترین اور مثالی سوانح حیات ہے۔ لیبان لکھتا ہے کہ
بابر کی سوانح عمری کا مقابلہ سیزر کی تاریخ سے کیا جا سکتا ہے، اور اپنے موضوع پر فی الواقع
ایک بہت اعلیٰ درجہ کی تصنیف ہے، الفنسٹن کے خیال میں بابر کی سوانح عمری ایشیا کی
صحیح تاریخ کا ایک نادر ٹکڑا ہے۔

ہیرالڈ لیم کا بیان ہے کہ بابر نے اپنی گمنام سی مادری زبان چغتائی ترکی میں فرغانہ
اور خود اپنی زندگی کے حالات لکھکر اس عہد خموشی میں اپنی آواز لوگوں کے کانوں تک
پہنچا دی، چنانچہ آج بھی جبکہ اس کو لکھے ہوئے پانچ سو برس کے قریب گزر چکے ہیں، یہ داستان
اس طرح ہمیں سنائی دیتی ہے کہ گویا کہنے والا رات ہوتے پڑاؤ پر پہنچا ہے، دن بھر دشمن کے
تعاقب میں رہا، بلکہ زیادہ تر دشمن اس کے تعاقب میں رہے، پھر گھوڑے سے اتر کر خیمہ میں
آگ کے پاس بیٹھکر اپنی روداد سنا رہا ہے، اس روداد میں ہم کو اس عہد کی تصویر نظر آتی ہے
جو یورپ والوں کے زرنگار مشرق پر قبضہ جمانے سے پہلے کی کیفیت تھی۔ (مقدمہ بابر دی ٹائیگر)

بابر کے علمی اور ادبی کارناموں میں " تزک " کو بہت اونچا مقام حاصل ہے۔ ایشیا کی تاریخ
پر یہی ایسی کتاب ہے جس کو صحیح تاریخی نمونے کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے، تاریخ نگاروں کا اس پر
اتفاق ہے کہ جن حالات میں اسے قلم بند کیا گیا ہے، اس اعتبار سے اس کتاب کی اہمیت اور بھی
بڑھ جاتی ہے،

" تزک بابری " کی اہمیت اس سے ظاہر ہو کہ دنیا کی تمام اہم زبانوں میں اسکے ترجمے ہوئے۔
تزک بابری میں سنہ ۹۲۶ھ / سنہ ۱۵۲۰ء تک کے واقعات ہیں، تزک بابری کا نام " واقعات بابری "

اور "بابر نامہ" بھی ہیں۔

سرگئی نکولوف نے ایک مضمون "بابر نامہ کہاں لکھا گیا" کے عنوان سے رسالۂ "طلوع" بابت اپریل ۱۹۶۷ء میں لکھا ہے، اس میں لکھتا ہے کہ

"مشرقی ممالک کے قرون وسطیٰ کے مسلّمہ ماہر اور جواں سال تاجیک مورخ احرار مختاروف کا کہنا ہے کہ مشرقی ادب کی ناقابلِ فراموش یادگار عظیم مغل خاندان کے بانی، افسانوی شاعر اور سپہ سالار کی خود نوشت سوانح "بابر نامہ" کے اولین صفحات وادی زرفشاں کی چٹانوں پر وجود میں آئے، نہ کہ ہندوستان کے آراستہ و پیراستہ محلوں میں، ان صفحات کا زمانۂ تصنیف ۱۵۱۰ء اور ۱۵۱۲ء کے درمیان ہے، جب بابر ایک چھوٹا سا خود مختار شاہزادہ تھا جس کے قبضے سے سلطنت نکل چکی تھی، اور پہاڑوں میں چھپا ہوا تھا، قابل سائنس داں نے بابر کی داستانِ حیات کی نامعلوم حقیقتوں کو ایک کوہستانی گاؤں کے گرد و نواح کی چٹانوں پر کندہ چھ کتبوں سے دریافت کیا ہے، کندہ کرنے والے کی تحریر اور دستخطوں کی تحقیق کے بعد مورخ کو اس کا یقین ہے کہ یہ تمام کتبے بابر کے ہاتھ کے ہیں، (بابر نے 'بابر نامہ' میں ایسے صرف ایک ہی کتبے کا ذکر کیا ہے)

زرفشاں کے کتبے میں قنوطیت کا رنگ ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے ہونے والے شہنشاہ کو اس کی کوئی امید باقی نہ رہی تھی کہ وہ اپنے موروثی شہروں فرغانہ اور سمرقند کو دوبارہ حاصل کر سکے گا، اس کا اظہار زیادہ تر سعدی اور حافظ کی رباعیوں کے ذریعہ کیا گیا، بلکہ بابر نے ایک طرح سے ان عظیم شاعروں کے تخیلات کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنا کر اپنی بدبختی پر آنسو بہائے ہیں۔

احرار مختاروف نے اس عبارت کو غیر معمولی ادبی صلاحیت کا حامل قرار دیا ہے جس نے

بعد میں بابر جیسے شاعر اور سپاہی کی تصنیف "بابر نامہ" اور اس کے دوسرے خیالات کو جلا بخشی، بابر نے ہی چغتائی (قدیم ازبک) زبان میں ادب کی بنیاد رکھی"

گلبدن بیگم کا بیان ہے کہ "سیکری (ہندوستان) میں اس کے شاہ بابا نے جو عمارتیں بنوائی ہیں ان ہی میں سے ایک وہ بھی جہاں بیٹھ کر وہ اپنی تزک لکھا کرتا تھا۔

تزک کا نسخہ

بابر کے قلم کا لکھا ہوا تزک کا نسخہ ناپید ہو چکا ہے، مگر اس کی زندگی میں اور اس کے کچھ بعد اس کی اور اس کے فارسی ترجمہ کی نقلیں کر لی گئی تھیں، جن میں سے ایک نقل خواجہ کلاں کے پاس تھی، اور ایک نسخہ میرزا حیدر دوغلات کے پاس تھا، ہمایوں نے اپنے ہاتھ سے ایک نقل کی تھی اور اس پر حواشی بھی لکھے تھے، اور باپ نے اس کے افعال پر جو نکتہ چینی کی اور دہلی کے خزانے لٹوانے کے ذکر میں بھی کوئی کمی بیشی نہیں کی، گلبدن بیگم نے بھی بابر نامہ کے فارسی نسخے سے کام لیا تھا، شاہجہاں کے کتب خانے میں اس کا مکمل نسخہ موجود تھا جس کی بہت عمدہ تذہیب و تزئین کی گئی تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل خاندان اس سوانح عمری کی بڑی قدر کرتے تھے، اس لیے اس کے نسخے کسی تدوین و تبویب اور تصرف کے بغیر ہم تک پہنچے، گو فارسی اور ترکی نسخوں میں لفظی اختلافات ہیں، مگر معنی و مطالب میں کوئی فرق نہیں، اور جو بیاضیں بابر نے چھوڑ دی تھیں وہ بھی بجنسہ ان نسخوں میں موجود ہیں، اسلیے ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جو تزک بابری ہم آج پڑھ رہے ہیں، بجز چند مشکوک جزئیات کے وہی ہے، جسے ساڑھے چار سو برس پہلے اس نے لکھا تھا۔ (ہیرالڈ لیم)

تحقیقاتی مہم

قدیم مسودات کے یوگومجی عجائب گھر کے سابق ڈائرکٹر اور اس تحقیقاتی مہم کے سربراہ، جو قدیم مسودات اور نوادر کی تلاش کرتی ہے، یوسف بیگ مخلصوف کا بیان ہے کہ ۱۹۵۵ء میں اس تحقیقاتی مہم کو جار شہر میں ظہیرالدین بابر کی ایک کتاب ملی تھی،

اس کا نسخہ خوبصورت تحریر میں "ہوتانسکی" کاغذ پر سیاہ ہندوستانی روشنائی میں تحریر تھا، اور عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے گئے تھے۔ اس کتاب میں ترکی عروض کی وضاحت کی گئی ہے، یہ نسخہ کسی عثمانی ترک نے از سر نو لکھا تھا، اس لیے اس میں ترکی زبان کے عناصر خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ (حریت ۱۳ر اکتوبر ۱۹۶۷ء)

علی شیر نوائی کے کلام پر تنقید

ایک روسی ادیب لکھتا ہے کہ "ظہیر الدین بابر مشرق کا ایک روشن خیال بادشاہ، ایک ممتاز شاعر اور علم و دانش کا پرستار تھا، اس نے شہرۂ آفاق "بابر نامہ" کے علاوہ بہترین اشعار، اور رباعیاں لکھیں، جن میں اسلام کے اصولوں کی تبلیغ کی گئی تھی، اس کے علاوہ متعدد کتابیں فوجی امور، موسیقی اور شعر و ادب سے متعلق لکھیں،

بابر نامہ میں ہمعصروں کے تذکرہ میں عظیم شاعر 'علی شیر نوائی' کے ۲۴ بحروں کے ذکر میں لکھتا ہے کہ چار بحروں کی تشریح میں اس سے غلطی سرزد ہوگئی ہے، دوسرے بحروں میں بھی اس نے غلطی کی ہے، اس کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جو نظم گوئی میں قدرت رکھتا ہے، شاعری سے متعلق بابر کی وہ کتاب محفوظ نہیں رہی، جس میں بابر نے ان غلطیوں کی طرف اشارے کیے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں ازبکستان کے مشہور مستشرق پروفیسر عزت سلطانوف نے علی شیر نوائی کی کتاب شائع کی ہے، اور اس پر تنقیدی دیباچہ بھی لکھا ہے، اس میں اس نے تسلیم کیا ہے کہ بابر کی تحریر کے مطابق اس نے چار غلطیوں کا پتہ لگایا ہے، جو علی شیر نوائی نے رباعیوں میں کی ہیں،

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بابر نے جو کچھ کہا تھا، وہ بالکل صحیح تھا، اور علی شیر نوائی جیسے عظیم شاعر اور ادبی نقاد کے کلام میں غلطی نکالنا شعر و ادب میں ان کی مہارت کا ثبوت ہے، اور عروض پر اس کی کتاب ترکی شاعری کی تاریخ میں ایک نئے باب کی حیثیت رکھتی ہوگی لیکن

افسوس ہے کہ یہ نادر تصنیف مشرقی علوم کا مطالعہ کرنے والوں کے سامنے نہیں۔

خواجہ آصفی کے کلام پر تنقید

خواجہ آصفی کے کلام کی نسبت بابر نے یہ مناسب رائے دی ہے:

"شعر او از رنگ و معنی خالی نیست اگرچہ از عشق و حال خالیست"۔[1]

کوئی بڑے سے بڑا نقاد بھی یہی رائے دے سکتا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بابر اچھا ادبی نقاد بھی تھا۔

بابر اور موسیقی

بابر اپنے جمالیاتی ذوق کی بنا پر فنون لطیفہ کا دلدادہ تھا اور موسیقی کا بھی ذوق رکھتا تھا، ولیم ارسکن کا بیان ہے کہ وہ موسیقی سے واقف ہی نہ تھا، بلکہ اس میں موجد بھی تھا، اس نے موسیقی میں جو نئے سُر ایجاد کیے ہیں وہ اس کا نام اس فن میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں، معاصر موسیقاروں کے حسن و قبح پر اس نے بڑا اچھا تبصرہ کیا ہے، ہیرالڈلیم لکھتا ہے کہ بابر کے کلام میں گہرائی زیادہ ہے، بہتین خیالات کو نغمے کی شکل میں ادا کرنے کا اس میں قدرتی میلان تھا جب اس پر انابت کی کیفیت طاری ہوتی تو وہ خواجۂ احرار کے ارشادات کو ترکی میں نظم کرتا کہ دوسرے لوگ بھی استفادہ کر سکیں،

بابر اور مصوری

بابر کو مصوری سے بھی کسی قدر ذوق تھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب وہ اپنی جان بچانے کے لیے سمرقند سے کابل بھاگا تھا، اس وقت بھی اس کے پاس ایسے قلمی نسخے تھے جن میں ہرات کے استادوں کی بنائی ہوئی تصویریں تھیں جنھیں بعد میں وہ ہندوستان بھی لے آیا، ان میں بعض نسخے جن پر بابر کی مہر ثبت ہے، آج بھی عجائب خانوں میں محفوظ ہیں، تزک بابری سے بھی بابر کے جمالیاتی ذوق کا پتہ چلتا ہے، اور جو رائے اس نے اپنے زمانہ کے مصوروں مثلاً بہزاد اور شاہ ظفر کے بارے میں ظاہر کی ہے، وہ مصوری میں اس کی دیدہ وری کا ثبوت ہے،

بدقسمتی سے چار پانچ سال کا وہ مختصر عرصہ جو ۱۵۲۶ء ہندوستان کی فتح سے لے کر

[1] حاشیہ منتخب التواریخ اور ترجمہ (تذکرۂ بابر)

۱۵۳۰ء وفات تک بابر کو میسر آیا سلطنت کی بنیادیں استوار کرنے میں صرف ہوا اور اس کو تمدنی و تعمیری کاموں کی مہلت ہی نہ ملی جس کا اس میں فطری مذاق تھا، بابر نامہ کا ایک قلمی نسخہ ایسا ملا ہے جس کی بابت تحقیق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ بابر کے زمانے کا ہے، یہ نسخہ الور میں محفوظ ہے، اس میں بھی صرف عبارت بابر کے زمانے کی ہے، اور تصویریں بہت بعد کی ہیں۔ (ثقافت پاکستان)

مسٹر ایم، ایس، ڈیمنڈ کا بیان ہے کہ بابر کے دربار میں جو تصویریں بنائی گئیں انکے بارے میں ہماری معلومات زیادہ نہیں ہیں، حالانکہ عربی مصادر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بادشاہ ایک عالم، فلسفی، سیاح، جہاں گشت، ماہر شکاری اور فطرت کا دلدادہ ہونے کے علاوہ، فنون لطیفہ کا بھی سرپرست تھا، مگر اس کے عہد حکومت سے بہت کم تصاویر منسوب کی جا سکتی ہیں، کہنل (Kuhnel) نے بحری جنگ کی ایک تصویر اس دور سے منسوب کی ہے، یہ تصویر ایک البم میں ہے جو کسی زمانے میں شہنشاہ جہانگیر کی ملکیت میں تھا، اب برلن کے سرکاری کتب خانہ میں ہے، اس میں بہزاد اور اس کے دبستان کا اثر صاف نظر آتا ہے، (مسلمانوں کے فنون)

خطاطی

ولیم ارسکن کا بیان ہے کہ" ادب کے ساتھ بابر کو فن خطاطی سے بھی گہری دلچسپی تھی، اور اس میں بھی اس نے مہارت حاصل کی تھی، اور نسخ و نستعلیق وغیرہ کا ماہر تھا،

منتخب التواریخ میں ہے کہ" بابر خطاطی کا بڑا قدردان اور ایک نئے خط کا موجد بھی تھا، جس کو خط بابری کہتے ہیں، بابر نے اس خط میں قرآن مجید کا ایک نسخہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر مکہ معظمہ بھیجا تھا،

یہ رسم الخط اس نے سنہ ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء میں ایجاد کیا تھا، اس کا خط نہایت پاکیزہ تھا اور مسطر اپنے ہاتھ سے بناتا تھا، (تذکرہ بابر)

بابر اور ہندی زبان

بابر نے ۹۳۲ھ میں ہندوستان فتح کیا، دہلی اور آگرے کی تسخیر کے بعد ۹۳۳ھ میں جو فتح نامے اطراف و اکناف میں بھیجے تھے، ان میں لشکر کو "اردوئے نصرت شعار" کے لقب سے موسوم کیا ہے، (بابر نامہ طبع قازان ص ۴۱۳)

بابر کے ایک سکہ پر جو ۹۳۶ھ میں مضروب ہوا ہے، "ضرب اردو" منقوش ہے۔ (دیکھو وائٹ ہیڈ کی فہرست سکہ جات سلاطین مغلیہ پنجاب میوزیم لاہور ص۴۲ بحوالہ اردوئے قدیم - از حکیم شمس اللہ قادری)

بابر کا ایک شعر مختلف کتابوں میں درج ہے، مولانا حکیم سید عبدالحئی نے "گل رعنا" میں اس شعر کو اسی طرح تحریر فرمایا ہے:-

مجکا نہ ہوکچ ہوس مانک و موتی   فقرا ہلیغہ بس بولغوسید ور پانی وردتی

مولانا کا بیان ہے کہ بابر کے ترکی دیوان کا جو نسخہ نواب رامپور کے کتب خانہ میں ہے وہ ۹۳۵ھ کا لکھا ہوا ہے اور خط نسخ میں ہے، اسی کے رسم الخط کے موافق اس شعر کو نقل کیا ہے۔

سید رفیق مارہروی صاحب اپنی کتاب "ہندوؤں میں اردو" (مطبوعہ نسیم بکڈپو لکھنو) میں لکھتے ہیں کہ" بابر کا یہ شعر ایک ترکی کتاب میں خود اسی کے ہاتھوں سے لکھا ہوا موجود ہے' یہ کتاب "رضا لائبریری" رامپور میں محفوظ ہے، جس پر اکبر، خانخاناں، اور شاہجہاں کی مہریں یا ان کے دستخط موجود ہیں،

مطالعہ اور کتابوں کے جمع کرنے کا شوق

بابر کو مطالعہ کا بڑا ذوق تھا، اس لیے وہ سفر و حضر دونوں میں کتابیں اپنے ساتھ رکھتا تھا، فتوحات میں جب کوئی کتب خانہ ملتا تو اپنے بیٹوں کے پاس بھی کچھ کتابیں بھیجدیا کرتا تھا، شاہنامہ فردوسی، خمسۂ نظامی مثنوی خسرو وغیرہ اس کی پسندیدہ کتابیں تھیں۔

میدان جنگ اور سفر میں علمی مشغلہ

اسکے علمی ذوق کا یہ عالم تھا کہ میدان جنگ میں بھی جب فرصت ملتی تو بیاض نکالی اور شعر پڑھنے بیٹھ گیا، طبیعت کو موزوں پایا تو اس بیاض میں اور اضافہ کر دیا۔ (بزم تیموریہ)

سردی کی طویل راتوں میں ملک کے حالات روزنامچے میں لکھتا رہتا، یہ تحریریں پوستین کے لبادوں میں لپیٹ کر، ہوا سے جھلملاتے چراغ کی روشنی میں لکھی ہوتی تھیں (ہیرالڈ لیم)

ایک شب کو بنگال سے واپسی میں باد و باراں کا طوفان اٹھا، اُس وقت بھی بابر لکھنے میں مشغول تھا، وہ لکھتا ہے کہ اس درجہ خوفناک آندھی چلی کہ مجھے کتاب کے اوراق سمیٹنے کی مہلت نہ ملی اور میرا خیمہ اکھڑ کر میرے سر پر گر پڑا خیمہ کی رسیاں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں، میں نے بڑی مشکل سے کتاب کے اجزا اکٹھے کر کے انکو پیٹ کے ساتھ چپکا لیا، اور اوپر سے کمبل اوڑھ لیا، طوفان اسقدر سخت تھا کہ شاید ہی کوئی خیمہ اکھڑنے سے بچا ہو، دو گھڑی کے بعد طوفان رکا تو توشے خانے کا خیمہ استوار کرایا، شمع روشن کرائی، آگ جلوائی اور بھیگے ہوئے اوراق سکھائے اور رات بھر ایک لمحہ کیلئے نہیں سویا۔

بابری عہد کے ارباب کمال

لین پول کا بیان ہے کہ بابر صاحبِ تصنیف سپاہی تھا، اس کا مذاق اور اس کی نکتہ سنجی کم درجہ کی نہ تھی، اس کا دربار ملک کے مختلف حصوں کے عالموں سے بھرا ہوا تھا، علامہ ابوالفضل لکھتے ہیں کہ علم و ادب کے ان بے شمار روشن سیاروں میں جو بابر کے فلک رفعت دربار میں جگمگاتے رہتے تھے، مولانا شہاب الدین معمائی حقیری، مولانا یوسف طبیب خراسانی، شیخ عبدالاحد، مرزا ابراہیم ہراتی، شیخ زین الدین، مولانا بقائی اور خواجہ نظام الدین علی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

خطبۂ استقبالیہ

اجلاس آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس

(منعقدہ دارالمصنفین اعظم گڑھ)

شاہ معین الدین احمد ندوی

جنابِ صدر، مہمانانِ محترم اور حاضرین جلسہ!

آپ جیسی صاحبِ علم شخصیتوں نے جس ویرانے میں تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائی ہے وہ اگرچہ بعض حیثیتوں سے اس صوبہ کا پسماندہ خطہ ہے، لیکن شیراز ہند جونپور کی قربت کے اثر سے ہمیشہ دینی تعلیم اور اسکے اصحاب علم و کمال کا مرکز رہا ہے، ضلع اعظم گڑھ میں عربی کے جس قدر مدارس ہیں ہندستان کے کسی ضلع میں نہیں مل سکتے، اس کے قصبات چریاکوٹ، گھوسی اور سرائمیر میں بڑے بڑے علما و مشائخ پیدا ہوئے۔ ملا محمود جونپوری صاحبِ شمس بازغہ، مولانا عنایت رسول چریاکوٹی، استاذ العلماء مولانا فاروق چریاکوٹی، ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی، متکلم اسلام مولانا شبلی اسی آسمان علم کے مہر و ماہ تھے، ان میں مولانا شبلیؒ کی حیثیت نیر تاباں کی تھی، جن کی ضیا پاشی سے پورا ہندستان منور ہوا، انھوں نے پورا نظام شمسی قائم کر دیا تھا جو ان کی دکھائی ہوئی روشنی میں ابتک علم و فن کی خدمت میں مصروف ہے، مولانا شبلی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اسلامی علوم و فنون پر تلاش و تحقیق کی نئی راہ نکالدی اور اہل علم میں اس کا ذوق پیدا کر دیا جس پر اس راہ کے رہرو آجتک گامزن ہیں، مولانا شبلی کی عظمت عرب و عجم تک میں مسلم تھی جس پر ان کی تصانیف کے عربی، فارسی اور ترکی ترجمے شاہد ہیں،

اس لیے ان کی یادگار دار المصنفین اہل علم کی توجہ کی مستحق تھی، اسی کی کشش آپ کو اس دور افتادہ خطہ
میں کھینچ لائی، ورنہ کہاں اعظم گڈھ کا ویرانہ اور کہاں اہل علم کا یہ مجمع۔

کہاں ہم اور کہاں یہ نکہت گل نسیم صبح تیری مہربانی

ارکان دار المصنفین آپ حضرات کی اس زحمت فرمائی کے شکرگزار ہیں اور اپنی اور باشندگان
اعظم گڈھ کی طرف سے آپ کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں۔

حضرات! مسلمانوں نے علم و فن کی جو خدمت کی ہے اور دینی علوم سے قطع نظر خالص دنیاوی
علوم کو جس قدر ترقی دی، قدیم علوم کی جس طرح حفاظت کی اور ان کو دوسروں تک پہنچایا اور
جو نئے علوم پیدا کیے اور اپنے ایجادات و انکشافات سے دنیا کو جو فائدہ پہنچایا اور علم و فن کی ہر
شاخ پر جو عظیم الشان ذخیرہ یادگار چھوڑا، اس کی تفصیل کے لیے ایک دفتر چاہیے، اس خطبہ میں
اس کی تفصیل مقصود نہیں۔

ع :- سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لیے

اس لیے آیندہ سطور میں صرف ہندوستانی مسلمانوں کی علمی خدمات پر سرسری نظر ڈالی جائےگی،
اور آیندہ کاموں کے متعلق بعض خیالات پیش کیے جائیں گے،

حضرات! ہندوستان ایک زمانہ تک اسلامی تہذیب و ثقافت کا مرکز رہ چکا ہے اور
اس کو اس سلسلہ میں بعض ایسی خصوصیات حاصل تھیں، جو کسی اسلامی ملک کو حاصل نہ تھیں، یہاں
کے سلاطین و امرا کی فیاضی اور قدر دانی سے مختلف اسلامی ملکوں خصوصاً وسط ایشیا کے تمام
علمی مرکزوں عراق و ایران سے لیکر ترکستان بلکہ حجاز تک کے علما کھنچ کھنچ کر ہندوستان میں
جمع ہو گئے تھے اور دلی، جونپور اور دوسرے پایہ تخت رشک بغداد و قرطبہ بن گئے تھے، جن کی
نظیر کسی دوسرے اسلامی ملک میں نہیں مل سکتی۔

ان علما کی آمد کا سلسلہ ابتدا سے لے کر مغلوں کے دور عروج بلکہ کچھ نہ کچھ دور زوال تک
برابر جاری رہا، اور انھوں نے ہندوستان میں مستقل سکونت اختیار کر لی، ان کے بعد ان کی
نسل میں علم و فن، درس و تدریس اور تالیف و تصنیف کا سلسلہ برابر قائم رہا، اور ایک ایک
خاندان میں اتنے علما پیدا ہوئے جن کی نظیر کسی اسلامی ملک کے ایک خاندان میں مشکل سے
ملے گی، اس کی مثال فرنگی محل اور شاہ ولی اللہ کا خاندان ہے۔

ان میں اس پایہ کے علما پیدا ہوئے جن کی عظمت اسلامی دنیا میں بھی مسلم تھی، دینی علوم
میں خصوصیت کے ساتھ ان کے بڑے کارنامے ہیں، انھوں نے اپنے بعد بہت بڑا علمی ذخیرہ
یادگار چھوڑا، جو قدر و قیمت میں اسلامی دنیا کے ذخیروں سے کم نہیں، ان کی تفصیل کی
گنجایش نہیں، اس لیے ہر فن کے کچھ نامور علما کے صرف نام پیش کیے جاتے ہیں:

امام حسن صغانی لاہوری، ملا محمد بن طاہر پٹنی، شیخ علی متقی برہان پوری، شیخ وجیہ الدین
گجراتی، شیخ عبداللہ تلبنی، شیخ علاء الدین مہائمی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ان کے صاحبزادے نور الحق،
قاضی عبد المقتدر دہلوی، حضرت مجدد الف ثانی، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، ملک العلماء قاضی شہاب الدین
دولت آبادی، ملا محمود جونپوری، ملا عبد الحکیم سیالکوٹی، مفتی عبد السلام لاہوری، ملا نظام الدین
اور ان کا خاندان، شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، ان دونوں خاندانوں کے کارنامے
اظہر من الشمس ہیں، ملا نظام الدین کا درس نظامی ابتک ہندوستان کے عربی مدارس میں جاری ہے،
سعد بن مسعود سلمان، امیر خسرو، شیخ فتح اللہ شیرازی، میر عبد الجلیل بلگرامی، غلام علی آزاد بلگرامی،
علامہ محمد مرتضیٰ زبیدی بلگرامی، ابو الفضل، ملا عبد القادر بدایونی، شیخ عبد النبی، شیخ محمد علی تھانوی،
علامہ تفضل حسین، لطف اللہ و خیر اللہ مہندس وغیرہ، ان کے خدمات سے علم و فن کا کوئی گوشہ
خالی نہ تھا،

یہ موسم بہار کا منظر تھا، موسم خزاں کی بہار آفرینی بھی کچھ کم نہیں ہے، اس دور میں مولانا عبد الحی فرنگی محلی، نواب صدیق حسن خاں، مولانا مملوک العلی، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا فضل حق خیر آبادی، سر سید احمد خاں، مفتی صدر الدین آزردہ، مولانا صہبائی، مولانا شبلی، مولانا سید عبد الحی سابق ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء، مولانا محمود الحسن ٹونکی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا سید سلیمان ندوی جیسی شخصیتیں پیدا ہوئیں، جن کی تصانیف نے مسلمانوں کی مذہبی علمی اور تمدنی تاریخ کو زندہ کر دیا، جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں سید امیر علی، سید علی بلگرامی، خواجہ کمال الدین، پرنسپل محمد شفیع مرحوم، پروفیسر محمود شیرانی، پروفیسر نواب علی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، اور یہ سلسلہ بحمد اللہ اب بھی قائم ہے، بلکہ اس میں بعض حیثیتوں سے اضافہ ہو گیا ہے، اور انھوں نے اسلامیات کے مختلف پہلوؤں پر انگریزی میں بھی محققانہ کتابیں لکھیں،

اس سلسلہ میں سر اقبال مرحوم کا نام نہ لینا بڑی بے انصافی ہے. گو اصلاحی معنوں میں اسلامی علوم پر انھوں نے کوئی تحقیقی کام نہیں کیا، لیکن اسلامی تعلیمات کی حکیمانہ تعبیر اور ہندوستانی مسلمانوں میں اسلامی روح پیدا کرنے اور اسلامی تہذیب و ثقافت زندہ رکھنے میں ان کی شاعری کا بڑا حصہ ہے، یہ سیکڑوں ناموں میں سے صرف چند نام ہیں،

ہندوستان کے علمی اداروں نے بھی اسلامی علوم کی بڑی خدمت انجام دی، ان میں سب سے قدیم ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ہے، جس نے مختلف فنون کی عربی اور فارسی کی بڑی اہم کتابیں شائع کیں، موجودہ اداروں میں دائرۃ المعارف حیدر آباد سب سے زیادہ خدمت انجام دے رہا ہے، اس نے قدماء کی ہر علم و فن کی سیکڑوں نادر و نایاب کتابیں شائع کیں۔ اس کے خدمات اسلامی ملکوں کے کسی علمی ادارہ سے کم نہیں ہیں، ائمہ احناف اور فقہ حنفی کی قدیم اہم کتابوں کی اشاعت احیاء معارف نعمانیہ حیدر آباد کا کارنامہ ہے، مجلس علمی ڈابھیل بھی اس سلسلہ میں مفید کام کر رہی ہے،

اس سلسلہ میں نولکشور پریس کا نام لینا بھی ضروری ہو، اس نے تنہا اسلامی علوم و فنون کی اتنی کتابیں شائع کیں، جسکی مثال ہندوستان کیا اسلامی ملک میں بھی نہیں مل سکتی، گو اسکی مطبوعات صحت اور طباعت کے لحاظ سے ناقص ہیں لیکن یہ اسکا بڑا کارنامہ ہو کہ اس نے اس ذخیرہ کو چھاپ کر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا، کلکتہ، دلی اور لکھنؤ وغیرہ کے اور مطابع نے بھی بہت سی کتابیں شائع کیں، اس کی تفصیل کی یہاں گنجایش نہیں، بمبئی کے عربی کتابوں کے تاجر بھی اپنے صرف سے اہم کتابیں چھپواتے رہتے ہیں، دار المصنفین نے اپنی پچاس سالہ زندگی میں جو بڑی بھلی خدمت انجام دی ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں، اس نے اردو کے علاوہ عربی کی چند اہم کتابیں بھی شائع کیں، ابو مسلم اصفہانی معتزلی کی تفسیر اب ناپید ہے، امام رازی نے تفسیر کبیر میں جابجا اس کے جو اقتباسات نقل کیے ہیں، ان کو جمع کر کے شائع کیا، مولانا عبد الحمید فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی فاضلانہ تصنیف ابو العلاء و ما الیہ، امام سیوطی کا رسالہ عین الاصابہ فیما استدرکتہ السیدۃ عائشۃ علی الصحابہ، عمر خیام کے فلسفیانہ رسالے، سیرت عائشہؓ اور سوانح عمر خیام کے ساتھ شائع کیے، ہمارے ہم ردیف و ہم قافیہ ندوۃ المصنفین کے خدمات سے آپ حضرات واقف ہیں۔

اس سلسلہ میں مجلس تحقیقات و نشریات اسلام دار العلوم ندوۃ العلماء کا بھی ذکر ضروری ہو، گو اس کی عمر چند سال سے زیادہ نہیں ہے، لیکن اس مختصر مدت میں اس نے اردو، عربی اور انگریزی میں متعدد مفید کتابیں شائع کیں، بہار عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں بھی مفید کام ہو رہا ہے،

اس اجلاس کے محترم صدر جناب حکیم عبد الحمید صاحب نے جن کا قدم ہر اچھے کام میں آگے رہتا ہے اسلامیات کی تحقیقات کا ایک ادارہ قائم کیا ہے، اس مختصر جائزہ سے اندازہ ہوگا کہ اسلامی علوم کی خدمت میں ہندوستان کے مسلمانوں کا کتنا بڑا حصہ ہے، موجودہ دور میں ان کاموں کی ضرورت اور زیادہ بڑھ گئی ہے، اور ابھی بہت سے کام اہل علم کی توجہ کے محتاج ہیں۔

ان میں سب سے مقدم ان اہم کتابوں کی اشاعت ہے جو ابتک نہیں چھپ سکی ہیں، مولانا

محمد ہاشم ندوی کا اہل علم کو شکر گذار ہونا چاہیے کہ انھوں نے مختلف علوم کی ان اہم اور نادر کتابوں کی جن کے قلمی نسخے دنیا کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، مکمل فہرست تذکرۃ النوادر کے نام سے مرتب کرکے شائع کر دی ہے۔

(۲) دور جدید نے جو سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی مسائل پیدا کر دیے ہیں، اسلامی نقطۂ نظر سے اس کا حل پیش کرنے کی ضرورت ہے، جامعۂ عثمانیہ مرحوم کے شعبۂ دینیات نے اس کے بعض پہلوؤں پر تحقیقی مقالے لکھوائے تھے، ان میں سے بعض شائع بھی ہو چکے ہیں مگر

ع :۔ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

جماعت اسلامی نے بھی بعض مختصر کتابیں شائع کی ہیں، کچھ متفرق مضامین بھی لکھے گئے لیکن ابھی اس پر کوئی مستقل کام نہیں ہوا ہے، اور یہ مسائل اہل علم کی توجہ کے محتاج ہیں، مسلم یونیورسٹی کے اسلامیات اور دینیات کے شعبوں کو اس میں جامعۂ عثمانیہ کی قائم مقامی کرنی چاہیے۔

(۳) ہندوستان اسلامی اخلاق و روحانیت کا صحیح نمونہ صوفیائے کرام نے پیش کیا، اگر علماء نے اسلام کے جسم کو قائم رکھا تو صوفیائے کرام نے جن میں وہ علماء بھی شامل ہیں، جو شریعت و طریقت کے جامع تھے، اسکی روح کو زندہ رکھا، ان ہی کی بدولت ہندوستان میں اسلام کی اشاعت ہوئی، وہ

ع در کفِ جام شریعت در کفِ سندانِ عشق

کا نمونہ تھے، ایک طرف ان کا قدم جادۂ شریعت سے باہر نہیں نکلا، دوسری طرف ان کے اخلاق و پیام محبت میں اس قدر کشش تھی کہ بلا امتیاز مذہب و ملت سب کے سر عقیدت ان کے سامنے جھکتے تھے، اور آج بھی انکے آستانوں پر خم ہوتے ہیں، اور آج بھی ان کے حالات سے بڑا سبق حاصل ہو سکتا ہے، لیکن یہ حالات کشف و کرامت کے حجاب میں گم ہیں، اس لیے ان کے صحیح حالات اور انکی زندگی کے اخلاقی و روحانی پہلوؤں کو پیش کرنے کی بڑی ضرورت ہے، اور موجودہ ہندوستان میں یہ ضرورت اور بھی بڑھ گئی ہے، پروفیسر خلیق احمد نظامی

نے اس سلسلہ میں کئی مفید کتابیں لکھی ہیں، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے تاریخ دعوت و عزیمت میں بعض اکابر صوفیہ کے حالات تحریر کیے ہیں، ہمارے رفیق کار سید صباح الدین عبد الرحمٰن کی بزم صوفیہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، لیکن اس سلسلہ کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔

مستشرقین کے خدمات

آخر میں مستشرقین کے متعلق بھی کچھ کہنا ضروری ہے، ان کے خدمات کا اعتراف نہ کرنا ناسپاسی ہوگی، انھوں نے اسلامی علوم و فنون کی بڑی خدمت کی ہے، جو خود مسلمانوں سے بھی نہ ہو سکی، انھوں نے مختلف علوم و فنون کی سیکڑوں نادر و نایاب کتابیں جنکے دیکھنے کو آنکھیں ترستی تھیں اور جن کے نام صرف کتابوں میں ملتے تھے، تلاش کرکے بڑی محنت سے تحقیق اور تصحیح و تحشیہ کے پورے اہتمام کے ساتھ شائع کیں۔

تاریخ میں تاریخ طبری، کامل ابن اثیر، مروج الذہب اور کتاب التنبیہ والاشراف مسعودی، تاریخ یعقوبی ابن واضح کاتب عباسی، اخبار الطوال ابو حنیفہ دینوری، کتاب البداء والتاریخ ابو زید بلخی، غرر اخبار ملوک الفرس ثعالبی، تاریخ ملوک الارض حمزہ اصفہانی وغیرہ۔ سفرناموں میں سفرنامۂ ابن جبیر، سفرنامہ سلیمان تاجر اور سفرنامہ بزرگ بن شہریار وغیرہ۔

جغرافیہ میں کتاب البلدان یعقوبی، کتاب البلدان ابن فقیہ ہمدانی، اعلاق النفیسہ ابن رستہ، المسالک والممالک ابن خرداذبہ، احسن التقاسیم بشاری مقدسی، مسالک الامصار ابن فضل اللہ عمری، نزہۃ المشتاق ادریسی، تقویم البلدان ابو الفداء، نزہۃ القلوب حمد اللہ مستوفی وغیرہ۔

طبقات و تراجم میں طبقات ابن سعد کی ضخیم مجلدات، معجم الادباء یاقوت حموی، تحفۃ الامراء باخبار الوزراء ہلال بن محسن صابی، کتاب الوزراء محمد بن عبدوس جہشیاری، کتاب الولاۃ والقضاۃ کندی، طبقات الشعراء ابن قتیبہ، کتاب الانساب سمعانی، انساب الاشراف بلاذری وغیرہ۔

تاریخ علوم میں کتاب الہند بیرونی، طبقات الامم صاعد اندلسی، فہرست ابن ندیم وغیرہ

مستشرقین نے عربی کی مطبوعہ کتابوں کی ضخیم فہرستیں بھی مرتب کیں، اور آیات قرآنی اور احادیث نبوی کا انڈکس مرتب کیا جس سے ان کی تلاش میں بڑی سہولت ہوگئی، اور دوسرے علوم کی سیکڑوں کتابیں شائع کیں۔ ان سب کا استقصا مقصود نہیں، مثلاً مختلف فنون کی چند کتابوں کے نام لکھ دیے گئے، ان میں سے بہت سی کتابیں اب مصر وغیرہ میں چھپ گئی ہیں، لیکن اولیت کا سہرا مستشرقین کے سر ہے۔

اس کے علاوہ یورپ کے کتب خانوں کے عربی و فارسی نوادر کی مکمل فہرستیں مرتب کیں جن سے وہاں کا پورا علمی ذخیرہ نگاہ کے سامنے آجاتا ہے، مسلمانوں کے علوم اور انکی تہذیب و ثقافت پر بہت سی کتابیں لکھیں، ان کے ان خدمات سے انکار ممکن نہیں لیکن اسی کے ساتھ بعض مستشرقین نے مختلف تاریخی سیاسی اور مذہبی اسباب کی بنا پر مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی بڑی غلط تصویر پیش کی، انگریزوں نے اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر اسلامی ہند کی تاریخ کو جس طرح بگاڑا اس سے ہم سب واقف ہیں، بعض ہندوستانی اہل قلم نے جن کا ذہن مسلمانوں کی طرف سے صاف نہ تھا مستشرقین کی تقلید کی، جس سے ملک کو بڑا نقصان پہنچ رہا ہے، ہندوستان کی آزادی سے پہلے بعض ہندو مورخین نے بہت اچھی تاریخیں لکھیں لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمانوں کے خلاف زہریلی کتابوں کا ایک مستقل سلسلہ شروع ہوگیا، جس سے نصاب کی کتابیں بھی محفوظ نہیں، اس سے تنہا مسلمانوں کو نہیں بلکہ پورے ملک کو نقصان پہنچ رہا ہے، اس لیے نہ صرف علمی و تحقیقی، بلکہ قومی و ملکی مفاد کے نقطۂ نظر سے بھی ان غلط فہمیوں کے ازالہ و تعمیری نقطۂ نظر سے صحیح تاریخیں لکھنے کی ضرورت ہے،

علامہ شبلی نے مدتوں پہلے ان تمام ضرورتوں کو محسوس کرلیا تھا اور اس سلسلہ میں بڑے اہم مضامین لکھے اور اپنی تصنیفوں میں بھی اس کا لحاظ رکھا، انکی سب سے اہم تصنیف سیرۃ النبی کی تالیف کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی محققانہ سیرت لکھی جائے جس میں مستشرقین کے اعتراضات کا

جواب بھی آجائے، اس لیے دارالمصنفین نے شروع ہی سے اس مقصد کو پیش نظر رکھا، اور اس کی بیشتر تصنیفات کا مرکزی نقطہ یہی ہوتا ہے، "خطبات مدراس" اور "عرب و ہند کے تعلقات" اس سلسلہ کی اہم کتابیں ہیں، اسی نقطۂ نظر سے دارالمصنفین نے تاریخ ہند کا ایک مستقل سلسلہ شروع کیا ہے، اس سلسلہ میں "ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک"، "عہد مغلیہ ہند و مورخین کی نظر میں" اور "ہندوستان عربوں کی نظر میں" زیادہ اہم ہیں، مذہبی غلط فہمیوں کا ازالہ کے لیے "دین رحمت" لکھی گئی۔

اس سے انکار نہیں کہ اسلامی علوم و فنون کی خالص علمی تحقیق بھی ایک بڑی علمی خدمت اور مسلمانوں کا پرانا ورثہ ہے، اس لیے اس کو جاری رہنا چاہیے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ ہر زمانہ کے مسلمان فضلا و اہل علم نے خواہ ان کا تعلق کسی علم و فن سے رہا ہو، دین کی خدمت کو مقدم رکھا، اور اپنے علم کو اس کی نصرت و حمایت میں صرف کیا، تمام اسلامی علوم دینی ضرورت ہی سے پیدا ہوئے، اور مسلمان حکما، و فلاسفہ نے عقلی علوم سے بھی دین کی حمایت کا کام لیا، جس سے اصحاب علم واقف ہیں، اور اس زمانہ کے حالات میں پہلے سے بھی زیادہ اس کی ضرورت ہے، اس لیے آج بھی اسلامی علوم کی خدمت میں مسلمان اصحاب علم کا مرکزی نقطۂ نظر یہی ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر اس میں جان نہیں پیدا ہوسکتی

چمن میں تربیت غنچہ ہو نہیں سکتی — نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریک نسیم
وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں — تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم

یہ چند موٹی موٹی باتیں جو ذہن میں تھیں، پیش کردی گئیں، اس میں جو کمی رہ گئی ہوگی وہ امید ہے کہ فاضل صدر کے خطبۂ صدارت سے پوری ہوجائے گی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

ابن الہیثم کا جشن ہزار سالہ

(یکم تا دس نومبر ۱۹۶۹ء)

از جناب احمد خاں صاحب ایم، اے ادارہ تحقیقاتِ اسلامی اسلام آباد

ابو علی الحسن بن الحسن ابن الہیثم مشہور زمانہ ماہر بصریات ۳۵۵ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پر ابتدائی تعلیم پائی، بچپن ہی سے حصول علم کی طرف مائل تھے، اس لیے تھوڑی ہی مدت میں فارغ ہو کر تصنیف و تالیف میں لگ گئے۔ اور چند ہی دنوں میں اسقدر مشہور ہو گئے کہ ان کی شہرت سنکر فاطمی فرمانروا الحاکم نے مصر بلا بھیجا، باقی زندگی وہیں بسر کی اور مصر ہی میں ۴۳۰ھ کے بعد ان کا انتقال ہوا ہے۔

ابن الہیثم پہلے مسلمان ماہر طبیعیات، ہیئت داں، ریاضی داں اور طبیب تھے، بصریات میں ان کے بڑے کارنامے ہیں، انھوں نے اپنی تصنیف "کتاب المناظر" میں پہلی مرتبہ نظریۂ بصارت کی صحیح وضاحت کی ہے، مظاہر فطرت مثلاً نور، اشعۂ نور کے انعکاس و انعطاف، اغلاط بصر، شفق، قوس و قزح، ہالہ، سرابا، قوتِ ثقل، تحرکات، خلا، فضا، اور کثافت کے بارے میں اپنی تحقیقات سے بصریات کے فن میں وہ سنگ بنیاد رکھا ہے جس پر بعد کے سائنس دانوں نے پوری عمارت تعمیر کی ہے، اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ فلک کے سیاروں تک رسائی کی پہلی بنیاد ان ہی کے نظریات تھے،

ابن الہیثم کا اثر یورپ پر بہت زیادہ رہا ہے، چنانچہ تقریباً پانچ صدیوں (بارہویں تا

سترہویں صدی) تک اس کی کتابیں و نظریات یورپ میں مقبول و رائج رہے، اگر یہ شخص یورپ میں پیدا ہوا ہوتا تو اب تک ہزارہا کتابیں اس کی زندگی اور نظریات پر لکھی جا چکی ہوتیں، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل بطلیموس، کیپلر، بیکن وغیرہ سے تو پوری طرح واقف ہے، مگر اپنے اسلاف کی اس کو خبر نہیں، وہ ابن الہیثم کی نسبت نیوٹن سے زیادہ واقف ہے، حالانکہ نیوٹن کے نظریات میں ابن الہیثم کے نظریات کا ایک اہم حصہ ہے،

بیسویں صدی کے اوائل سے مسلمانوں نے اس کی طرف توجہ کی اور اپنے اسلاف کے کارناموں کو سمجھنا اور کسی حد تک ان پر فخر کرنا بھی شروع کر دیا ہے، اگرچہ اس کی رفتار سست ہے، تاہم یہ بیداری خوش آیند ہے۔ چنانچہ اب تک کئی مسلم محققین اور مدبرین اور شعراء کے ہزار سالہ یا پانچ سو سالہ جشن منائے جا چکے ہیں، اُن میں ابن الہیثم بھی ہیں۔

سب سے پہلے ابن الہیثم کا جشن منانے کا خیال قاہرہ یونیورسٹی کے ایک کالج (کلیۃ الہندسہ) کو آیا تھا، چنانچہ کالج کی مجلس نے مارچ ۱۹۳۹ء میں یہ طے کیا کہ ابن الہیثم کی وفات پر نو سو سال گذر چکے ہیں، اس لیے ابن الہیثم کی یادگار میں کالج میں اس کے متعلق تقریروں اور محاضرات کا ایک سلسلہ شروع کیا جائے، اس سلسلے کا نام انھوں نے "محاضرات ابن الہیثم التذکاریہ" رکھا۔ اس پروگرام کے تحت سب سے پہلا مقالہ مصطفےٰ نظیف بک نے پیش کیا، وہ مقالہ ۱۲ اپریل ۱۹۳۹ء کو شائع ہوا، اس کے بعد اور کئی مقالات ابن الہیثم کی زندگی اور اس کے نظریات کی تشریح میں لکھے گئے اور مذکورہ کالج کی طرف سے طبع ہوئے۔ ان محاضرات کے لیے مصر کے علاوہ دوسرے ملکوں کے علماء کو بھی بلایا گیا تھا،

اسی طرح مصر کی جمعیۃ المصریۃ العلوم الریاضیہ والطبعیۃ نے قاہرہ ہی میں ابن الہیثم کی

یاد میں ۱۲ر دسمبر ۱۹۳۹ء کو ایک عظیم الشان اجتماع کرایا جس میں یونیورسٹی کے اساتذہ کے علاوہ دوسرے اہل علم نے بھی شرکت کی اور انھوں نے علوم ریاضیات، فلسفہ، طبعیات، ہیئت، ہندسہ اور بصریات میں ابن الہیثم کے کارناموں پر تقریریں کیں۔ ان میں مصر کے چوٹی کے سائنسداں شامل تھے۔ اس طرح پہلی بار ابن الہیثم کے ہموطنوں نے اس کے کارناموں کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔

ابن الہیثم کے علمی کارناموں کو دنیا کے سامنے پیش کرنے میں مصطفیٰ نظیف بک کا بڑا حصہ ہے۔ انھوں نے ابن الہیثم کی کتاب المناظر کے مخطوطات کو بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے مرتب کر کے ۱۹۴۲ء میں "ابن الہیثم بحوثہ وکشوفہ البصریۃ" کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا، جن میں بصریات سے متعلق ابن الہیثم کے نظریات کی پوری وضاحت کی گئی ہے۔ اس طرح انھوں نے کسی حد تک ابن الہیثم کا حق ادا کر دیا۔

پاکستان میں ہمدرد فاؤنڈیشن نے ۱۹۶۵ء میں ابن الہیثم کا ہزار سالہ جشن منانے کا ایک جامع پروگرام بنایا تھا، مگر اچانک جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے یہ پروگرام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ ۱۹۶۷ء میں عربوں پر اسرائیلی حملے نے اس کام میں مزید تعطل پیدا کر دیا، کیونکہ اس جشن میں دنیائے اسلام کے ممتاز اہل علم کو دعوت دینے کا خیال تھا۔ اس کے بعد بھی اگرچہ کئی ضروری امور نامکمل رہ گئے، مگر اس مرتبہ جشن کو مزید تاخیر میں نہیں پڑنے دیا گیا اور سال کے شروع ہی میں دنیا کے ممتاز سائنسدانوں، ریاضی دانوں اور سائنسی علوم کی سوسائٹیوں کو اس جشن میں شرکت کی دعوت دی گئی اور ہمدرد فاؤنڈیشن نے ابن الہیثم پر دستیاب مواد کو ہر زبان سے انگریزی اور اردو میں منتقل کرنا شروع کر دیا، اور اس کا اختصار دعوت کے ساتھ اہل علم کے پاس بھیجا گیا۔ اس سے ابن الہیثم پر لکھنے والوں کو بڑی مدد ملی۔

جشن کے پروگرام کی ابتدا یکم نومبر ۱۹۶۹ء کو کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے کی۔ حکیم محمد سعید صدر ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن نے جشن کا تعارف کرایا اور آئندہ پروگرام کی تفصیل بیان کی۔ مسز ایل۔ اے ڈسلوا (Mrs. L. A. D'Silva) نے وہ پیغامات پڑھ کر سنائے جو دنیا کے ممتاز سائنسدانوں، اعلیٰ سفارتی نمائندوں اور بعض ملکوں کے سربراہوں کی طرف سے ہمدرد فاؤنڈیشن کو موصول ہوئے تھے۔[1]

پہلا سیشن کراچی انٹرکانٹی نینٹل میں ہوا، اور اس کی صدارت پاکستان کے مشہور سائنسداں اور نیشنل سائنٹیفک کونسل آف پاکستان کے سابق چیئرمین جناب ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی نے فرمائی۔ اختتامی تقریر ڈاکٹر حافظ محمد الیاس صاحب نے کی۔

دوسرا سیشن ۳ر نومبر ۱۹۶۹ء کو پشاور میں پاکستان فارسٹ انسٹی ٹیوٹ کے آڈیٹوریم میں ہوا۔ اس میں دو مقالے پڑھے گئے۔ ایک مقالہ جناب عبدالرؤف نوشہروی نے اور دوسرا ڈاکٹر ایم۔ اے خٹک نے پڑھا۔ اختتامی تقریر جسٹس شیخ عبدالحمید صاحب نے کی۔

تیسرا سیشن ۴ر نومبر ۱۹۶۹ء کو راولپنڈی کے انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل میں سہ پہر کو منعقد ہوا۔ اس میں اجلاس کی صدارت جناب ڈاکٹر رضی الدین صدیقی وائس چانسلر اسلام آباد یونیورسٹی

[1] یہ پیغامات دنیا کے ہر کونے سے موصول ہوئے تھے۔ صدر پاکستان جناب آغا محمد یحییٰ اور اردن کے جناب شاہ حسین کے علاوہ جرمنی کے وزیر صحت کے پیغام شامل تھے۔ انکے علاوہ جن ممالک کی سائنسی مجلسوں یا اداروں نے پیغامات دیئے، ان کے نام یہ ہیں: آسٹریلیا، آسٹریا، بلغاریہ، کینیڈا، چین، چیکوسلاواکیہ، ڈنمارک، فرانس، مغربی جرمنی، ہوائی، ہنگری، ہندوستان، ایران، جاپان، نیدرلینڈز، پولینڈ، روڈیشیا، جنوبی افریقہ، روس، انگلینڈ، اور امریکہ۔ یونیسکو کے ادارہ پیرس نے بھی ایک خاص پیغام ارسال کیا تھا، اور پاکستان سے تو بہت سے ممتاز اہل علم کے پیغامات وصول ہوئے تھے۔ ان پیغامات میں ابن الہیثم کے کارہائے نمایاں کو سراہا گیا اور ہمدرد فاؤنڈیشن کے اس اقدام پر اسے مبارکباد دی گئی۔

نے کی۔ اس میں صرف ایک مقالہ جناب محمد سعود صاحب ریسرچ فیلو ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد نے پیش کیا۔ وقت کی قلت، جو عام طور پر ایسے اجتماعات میں ہوا کرتی ہے، یہاں بھی رہی، اس لیے مقالے کا صرف اختصار پیش کیا گیا، اختتامی کلمات مس سعدیہ سعید نے کہے۔

اگلا اجلاس لاہور کے انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل میں ۶ نومبر ۱۹۶۹ء کو زیر صدارت جناب علامہ علاء الدین صدیقی وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی منعقد ہوا۔ اختتامی تقریر ڈاکٹر محمد باقر صاحب پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور نے کی، اس سشن میں پروفیسر حمید عسکری صاحب نے ایک مقالہ پڑھا جس کا عنوان تھا "ایک عظیم مسلم ماہر طبعیات"۔

لاہور ہی میں ۷ تا ۹ نومبر ۱۹۶۹ء یونیورسٹی سینٹ ہال میں ابن الہیثم سے متعلق مجالس مذاکرہ منعقد ہوئیں، ۷ نومبر کو میاں افضل حسین سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کی صدارت میں، ۸ کو جناب ڈاکٹر محمد باقر صاحب اور ۹ کو جناب زیڈ اے ہاشمی سکریٹری حکومت مغربی پاکستان کی صدارت میں یہ مذاکرات ہوئے، ان میں حسب ذیل مقالے پڑھے گئے۔

۱۔ حکیم محمد سعید صاحب:۔ "ابن الہیثم کی کتاب المناظر"۔

۲۔ پروفیسر نصیر احمد ناصر، سکریٹری اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام:۔ "ابن الہیثم کا فلسفہ"۔

۳۔ پروفیسر ابوبکر غزنوی، انجنیرنگ یونیورسٹی لاہور:۔ "ابن الہیثم کی شخصیت"۔

۴۔ پروفیسر عبدالبصیر پال، صدر شعبۂ طبعیات پنجاب یونیورسٹی:۔ "ابن الہیثم"۔

۵۔ پروفیسر علی اصغر زیدی: "ابن الہیثم بحیثیت ایک سائنسداں"۔

۶۔ ڈاکٹر رانا احسان الٰہی صدر شعبۂ عربی پنجاب یونیورسٹی:۔ "ابن الہیثم اور المرایا المحرقہ"۔

۷۔ پروفیسر خادم علی ہاشمی:۔ (کوئی خاص عنوان نہ تھا)

۸۔ چودھری عبدالغفور صاحب:۔ "سائنس کی تعلیم پر ابن الہیثم کا اثر"

۹۔ الحاج ذکار الملک اور ڈاکٹر ایس۔ ایم ناموس:۔ "اسلام کا ایک عظیم ماہر طبعیات"۔

۱۰۔ پروفیسر ایم۔ ایف قریشی:۔ "ابن الہیثم کے مطابق دائرہ میں مساوی الاضلاع مسدس کی بناوٹ"۔

۱۱۔ راقم الحروف کا مقالہ۔ عنوان تھا:۔ "ابن الہیثم کی تالیفی زندگی"۔

۸ نومبر کو کراچی یونیورسٹی میں بھی ایک مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی، اس مجلس کا افتتاح جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے کیا اور مندرجۂ ذیل مقالات پڑھے گئے:۔

۱۔ "ابن الہیثم کی سائنسی جد وجہد":۔ ڈاکٹر ایم۔ اے ایچ قادری پروفیسر علم الحیوانات کراچی یونیورسٹی۔

۲۔ "علم طبعیات کے ارتقاء میں ابن الہیثم کا کردار": ایس، ایم ترمذی پروفیسر طبعیات۔

۳۔ "بصریات ابن الہیثم":۔ ڈاکٹر ایم، اسلم خاں پروفیسر طبعیات۔

۴۔ "ابن الہیثم کا سائنسی اسلوب":۔ میجر آفتاب حسن صاحب۔ کراچی یونیورسٹی۔

اس مجلس کی صدارت جناب ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی صاحب نے کی۔

آخری اجتماع ۱۵ نومبر ۱۹۶۹ء کو ڈھاکہ انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل میں ہوا، اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر ایم، او غنی وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی نے کی۔ اس سیشن میں دو مقالات پڑھے گئے۔ ایک ڈاکٹر سراج الحق صاحب صدر شعبۂ عربی و اسلامیات ڈھاکہ یونیورسٹی نے پڑھا، دوسرا ڈاکٹر ایم، انیس علی صدر شعبۂ طبعیات ڈھاکہ یونیورسٹی نے۔

یہ جشن ملک گیر تھا، اس لیے پاکستان کے ہر طبقہ اور شعبہ (Department) نے اس میں حصہ لیا، اخبارات نے ابن الہیثم پر خاص مضامین شائع کیے، ریڈیو پاکستان کے مختلف اسٹیشنوں

ے اردو، انگریزی، پشتو، سندھی اور بنگالی میں ابن الہیثم پر تقریریں نشر کی گئیں، کراچی کے ریڈیو اسٹیشن نے ایک خصوصی پروگرام پیش کیا، جس میں کراچی کے ممتاز اہل علم نے حصہ لیا، لاہور اسٹیشن سے بھی بچوں کے پروگرام میں ۹ تاریخ کو پروفیسر علی ناصر زیدی نے ابن الہیثم پر تقریر کی۔ انکے علاوہ ہر سیشن کی مختصر روداد ہر مقامی ریڈیو اسٹیشن روزانہ نشر کرتا رہا، ٹیلیویژن پر مختلف سیشنوں کے پروگرام دکھائے گئے، ابن الہیثم کے سائنسی طریق تحقیق کا مظاہرہ کیا گیا، ابن الہیثم پر ایک ڈرامہ بھی دکھایا گیا۔

محکمۂ ڈاک نے ۱۳ نومبر کو ابن الہیثم کی یادگار میں ٹکٹ جاری کیا، جس میں ابن الہیثم کی بنائی ہوئی ایک جیومیٹریکل شکل اور اس کی پیدائش اور وفات کے سنہ درج ہیں۔

اس جشن کے تمام اخراجات ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن نے برداشت کیے، اس کے علاوہ ابن الہیثم کے ان رسائل کا اردو ترجمہ بھی شائع کیا جو حیدرآباد دکن سے ۱۳۵۷ھ میں چھپے تھے، یہ مترجم مقالات جشن کے موقع پر ممتاز اہل علم کو تحفۃً دیے گئے، اور ابن الہیثم کی بڑی تصویریں جو سیاہ زمین پر تنکوں سے بنائی گئی تھیں، ہر مقالہ نگار، اور دوسرے اہم شرکا، کو پیش کی گئیں۔ اس جشن کے ہر سیشن کا آغاز تلاوتِ قرآن سے اور بیشتر کارروائی اردو میں ہوئی، مگر بعض مقالات انگریزی میں بھی پڑھے گئے۔

جشن کا کام ابھی ختم نہیں ہوا ہے، اور جیسا کہ حکیم محمد سعید صاحب نے اپنے خطبے میں کہا ہے، اس کے لیے دنیا کے ممتاز اہل علم سے ابن الہیثم پر مقالات لکھوا کر ہمدرد فاؤنڈیشن اردو اور انگریزی دو زبانوں میں شائع کرے گا، جن میں اس یادگاری جشن کے مقالات بھی شامل ہوں گے، ابن الہیثم کی ایک مکمل ببلیوگرافی بھی تیار کی جارہی ہے، ہمدرد فاؤنڈیشن کے پروگرام میں یہ بھی ہے کہ دنیا کے کونے کونے سے ابن الہیثم کی تالیفات کے مخطوطات کے فوٹو حاصل کرکے اردو زبان میں ان کے تراجم شائع کیے جائیں، سب سے پہلے ابن الہیثم کی مشہور و معروف "کتاب المناظر" کا اردو ترجمہ شائع کرنے کا خیال ہے۔

ادبیات

غزل

از جناب علی جواد زیدی

صراحیِ عقل و خرد نے ہزار بار بھری
مگر ہے اب بھی وہی تشنگی و دردِ سری

بری لگی ہے انھیں اہلِ دل کی بات کھری
کہ عیشِ بزم سے بہتر ہے لطفِ دربدری

اٹھا لیا شبِ تاریک کے جھروکوں سے
مری بلند نگاہی نے گریۂ سحری

مرا خیال ہے اک موجِ تلخ کامیِ عشق
تری نگاہ ہے جادو نگر کی لال پری

پلک سے خار چنے جائیں گے بیاباں میں
ذرا بلند تو ہو لے مذاقِ دربدری

قریبِ دار ملی عزمِ خندہ گر کو مرے
ہر ایک آنکھ محبت کے آنسوؤں سے بھری

ہمیں میں تاب تماشا نہیں رہی ورنہ
وہی زمانہ، وہی زندگی کی جلوہ گری

نگاہِ حسن حجابوں میں رہ کے بھی بیباک
نگاہِ عشق بلاؤں میں گھر کے بھی ہے جری

کسی کے جلوۂ معصوم کا عطیہ نہ ہو
وہ پہلی چوٹ کہ مدت کے بعد بھی ہے ہری

یہی نگاہ کہ جس نے چبھوئے ہیں نشتر
اسی نگاہ کو پھر ہوگی فکرِ بخیہ گری

کہاں ملے گا وہ رقص و رباب مستی میں
دیا ہے زخمِ جگر نے جو ذوقِ نغمہ گری

یہ کون جانے گا زیدیؔ ہم اہلِ دل کے سوا
کتاب عشق میں اکثر مقام ہیں نظری

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

قفس والوں کی آخر باغباں تک بات جا پہنچی
کہاں کی بات تھی لیکن کہاں تک بات جا پہنچی

شکستِ دل سے فریاد و فغاں تک بات جا پہنچی
معاذ اللہ محبت میں یہاں تک بات جا پہنچی

کہاں چھپتی کہ جب دل سے زباں تک بات جا پہنچی
وہی آخر ہوا اُس بدگماں تک بات جا پہنچی

تجھے الزام کیا دوں جب تری شانِ ستم یہ ہو
ستم تو نے کیے اور آسماں تک بات جا پہنچی

چمن والوں میں تخریبِ چمن کا ذکر جب آیا
تو رفتہ رفتہ میرے آشیاں تک بات جا پہنچی

بالآخر بن گیا دل حسن کا خود آئینہ خانہ
رموزِ عشق و سرِّ دلبراں تک بات جا پہنچی

ہوئی تعریف اول دوستوں کی دستداری کی
مگر آخر خلوصِ دشمناں تک بات جا پہنچی

مجھے مٹنے کا اپنے غم نہیں، غم ہے تو بس یہ ہے
جو میرے بعد اُن کے امتحاں تک بات جا پہنچی

جرس کی آخری آواز نے چونکا دیا سب کو
مری واماندگی کی کارواں تک بات جا پہنچی

قفس میں ذکرِ تعمیرِ نشیمن کر نہ اے ہمدم
اگر در پردہ یہ برقِ تپاں تک بات جا پہنچی

محبت کی ہتک ہے عشق کی توہین ہے جوہرؔ
محبت میں اگر سود و زیاں تک بات جا پہنچی

نوائے عصر

جناب یحییٰ اعظمی کی قومی و ملی نظموں کا مجموعہ "نوائے حیات" عرصہ ہوا شائع ہو کر ارباب ذوق سے سندِ قبول حاصل کر چکا ہے، "نوائے عصر" ان کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے، جو ابھی ابھی شائع ہوا ہے، اس میں زیادہ تر ایسی وہ نظمیں ہیں جن میں انھوں نے ملک کی حیرت انگیز تعمیری ترقیوں اور کوششوں کو اپنے مشاہدات، محسوسات اور تاثرات کی روشنی میں خراجِ تحسین پیش کیا ہو شروع میں صدرِ جمہوریہ ہند جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کے قلم سے پیش لفظ ہے۔

ضخامت ۸۰ صفحے۔ قیمت: تے ر۔ پتہ: دار المصنفین، اعظم گڈھ

مطبوعاتِ جدیدہ

کتاب النفس و الروح و شرح قواہما — تصنیف امام فخر الدین رازی، مرتبہ ڈاکٹر محمد صغیر حسن معصومی
متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۲۰ مجلد

قیمت درج نہیں۔ پتہ: ادارۂ تحقیقات اسلام، اسلام آباد، پاکستان

امام فخر الدین رازی نے مختلف علوم پر سو سے زیادہ کتابیں لکھی تھیں، جو اکثر غیر مطبوع اور نایاب ہیں، زیر نظر رسالہ کے بھی صرف ایک ہی نسخہ کا جو بعض دوسرے رسائل کے ساتھ آکسفورڈ کے ایک کتب خانہ میں تھا، ابتک پتہ چل سکا ہے، یہ نسخہ حسنِ اتفاق سے مشہور فاضل ڈاکٹر صغیر حسن معصومی کی نظر سے ان کے قیام لندن کے زمانہ میں گذرا، انھوں نے اس کا فوٹو لے لیا، اور اب اس کو تصحیح و تہذیب کے بعد شائع کیا ہے، گو تراجم و فہارس کی کتابوں میں امام رازی کی اس تصنیف کا ذکر نہیں ملتا، لیکن اس کی لوح پر ان کا نام درج تھا، اور اس کے مندرجات اور طرز بیان وغیرہ کی بنا پر ڈاکٹر صاحب نے اس کو ان ہی کی تصنیف قرار دیا ہے، اور ان کے خیال میں حاجی خلیفہ نے کتاب النفس والروح اور قفطی نے کتاب الاخلاق کے نام سے دراصل اسی کتاب کا ذکر کیا ہے۔ اس کا موضوع فلسفہ اور علم الاخلاق ہے، اور یہ دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے میں علم الاخلاق کے اصولِ کلیہ کا ذکر نفس و روح کی حقیقت و ماہیت اور ان کے قویٰ و مراتب وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، اور دوسرے حصہ میں بعض رذائل و شہوات کے علاج کا بیان ہے۔ اس حیثیت سے اس کے مباحث امام غزالی کی احیاء العلوم سے ملتے جلتے ہیں، مصنف علام نے

عقلی و نقلی دونوں حیثیتوں سے ان مسائل پر فاضلانہ گفتگو کی ہے، فاضل مرتب نے شروع میں امام رازی کے مختصر حالات و کمالات اور اس رسالہ کے بارہ میں مفید معلومات تحریر کیے ہیں اور آخر میں ان کی ایک سو چودہ (۱۱۴) تصنیفات کے فن وار نام، آیات و احادیث کی تخریج، اسماء، و اعلام کا اشاریہ اور مضامین کی مفصل فہرست دی ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوگا، اگر حدیثوں کی تخریج میں اس کی صراحت بھی کر دی جاتی کہ وہ کن کتابوں میں ملیں گی تو زیادہ مفید ہوتا، اس نادر و نایاب کتاب کی اشاعت پر فاضل مرتب اور ادارہ تحقیقات اسلام دونوں اصحاب علم کے شکریے اور مبارکباد کے مستحق ہیں، کتابت و طباعت بڑی معیاری اور خوشنما ہے۔

تاریخ دعوت و عزیمت (حصہ اول)۔ مرتبہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ، طباعت بہتر، صفحات ۴۹۶ مجلد مع گرد پوش، قیمت عہ، پتہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے تاریخ دعوت و عزیمت کے نام سے جو مفید سلسلۂ تصنیف شروع کیا تھا، اس کی ابتک تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں، یہ سلسلہ اس قدر مقبول ہوا کہ شروع کی دو جلدیں جن کو دار المصنفین نے شائع کیا تھا، اب ختم ہو چکیں اور ان کی دوبارہ اشاعت کے لیے شائقین کا شدید اصرار تھا، اس لیے مجلس تحقیقات و نشریات نے جلد اول کا یہ دوسرا اڈیشن شائع کیا ہے، اس جلد میں شروع سے ساتویں ہجری تک کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں اور مشہور مصلحین کے علمی و عملی کمالات اور مجددانہ کارناموں کا ذکر ہے، اس اڈیشن میں بعض جزوی ترمیم کے علاوہ دو مفید اضافے بھی کیے گئے ہیں، ان میں "فتنۂ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش" خصوصیت سے قابل ذکر ہے، یہ اڈیشن بہت اہتمام سے شائع کیا گیا ہے، مگر کتابت کی متعدد غلطیاں رہ گئی ہیں، فہرست میں انڈکس کا ذکر ہے لیکن ہم کو جو نسخہ ملا ہے اس میں انڈکس نہیں ہے، امید ہے یہ اڈیشن پہلے سے زیادہ مقبول ہوگا۔

جائزۂ تراجم قرآنی ۔ مرتبہ مولانا محمد سالم قاسمی و سید عبد الرؤف و سید محبوب رضوی صاحبان، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت تے روپیے، پتہ مجلس معارف القرآن (اکیڈمی قرآن عظیم) دار العلوم، دیوبند

اس کتاب میں دنیا کی پچاس زبانوں کے ۳۷۹ تراجم قرآن کی اجمالی فہرست اور بعض ہندوستانی، فارسی اور فرنچ زبانوں کے تراجم کا قدرے تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے، جن ترجموں کا تفصیلی ذکر ہے ان کے سنہ اشاعت کی عموماً تصریح اور اردو ترجموں کے نمونے بھی دیے گئے ہیں، بعض کے خصوصیات اور سنہ تالیف و ترجمہ کا ذکر بھی ہے، اگر ہر ترجمہ کی اہم خصوصیات اور سنہ ترجمہ و تالیف کی تعیین اور مترجم کے مختصر حالات بھی دیدیے جاتے تو کتاب مزید معیاری اور تحقیقی ہو جاتی، کم از کم اردو ترجموں کی حد تک یہ کام زیادہ مشکل نہ تھا، ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ کا سنہ اشاعت ۱۸۹۹ء صحیح نہیں ہے، انھوں نے ۱۸۹۳ء میں ترجمہ کا کام شروع کیا تھا، اور وہ ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا تھا، صفحہ ۱۸ پر تذکرہ علمائے ہند مصنفہ محمد ایوب قادری لکھا گیا ہے، حالانکہ وہ مترجم ہیں، تراجم قرآن کے متعلق متفرق مضامین اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں، یہ غالباً اس موضوع پر پہلی باقاعدہ کتاب ہے، ظاہر ہے تراجم قرآن کا کوئی جائزہ اور فہرست مکمل نہیں ہو سکتی، تاہم مرتبین کی یہ کوشش و کاوش بھی قابل ستائش اور ایک مفید قرآنی خدمت ہے، اور وہ اس کے لیے طلبۂ قرآن کے شکریے کے مستحق ہیں۔

تعلیم کے ابتدائی اصول حصہ اول۔ تصنیف ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم، ترجمہ مولوی سلطین احمد بدایونی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۸ مجلد مع گرد پوش، قیمت صر، پتہ: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

پاکستان کے مشہور مفکر ڈاکٹر رفیع الدین صاحب سابق ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی کراچی، جن کا

حال ہی انتقال ہوا ہے، فلسفۂ تعلیم کے ماہر تھے، اور ایک جدید نصاب نظامِ تعلیم کے وضع و ترتیب میں مصروف تھے، یہ مفید کتاب ان کے تعلیمی تجربات اور غور و فکر کا نچوڑ ہے، اس میں انھوں نے اس کے ابتدائی اور بنیادی اصولوں کی خالص علمی اور منطقیانہ انداز میں وضاحت کی ہے، ان کے نزدیک زندگی اور تعلیم دونوں کا ایک ہی مقصد ہے، اور خدا کے کامل یقین اور روحانی و اخلاقی قدروں پر مبنی نظامِ تعلیم ہی سے قوم کو بلند نصب العین مل سکتا ہے، اس موضوع پر جدید طرز کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ زیادہ تر مغربی مفکرین اور ماہرینِ تعلیم کے خیالات و افکار پر مشتمل ہیں، ڈاکٹر صاحب نے ان پر متوازن اور بصیرت افروز تنقید اور ان صالح اصولوں کی نشاندہی کی ہے، جن کا اسلام داعی ہے، اصل کتاب انگریزی میں تھی، مولوی سبطین احمد صاحب بدایونی نے اس کے حصہ اول کا سلیس و شگفتہ اردو میں ترجمہ کیا ہے، اور اس پر مفید حواشی بھی تحریر کیے ہیں، اس کی اشاعت سے فنِ تعلیم پر ایک مفید اور فکر انگیز کتاب کا اضافہ ہوا، جو اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے خاص طور سے مطالعہ کے لائق ہے۔

اردو شاعری میں منظر نگاری۔ مرتبہ ڈاکٹر سلام سندیلوی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۰۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت غلہ پتہ: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ۔

زیرِ نظر کتاب مصنف کی ڈی لٹ کی ڈگری کا مقالہ ہے، اب انھوں نے اس کو اضافہ و ترمیم کے بعد شائع کیا ہے، اس میں اردو شاعری میں منظر نگاری کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے، یہ سات ابواب پر مشتمل ہے، شروع میں منظر نگاری کی تعریف، فطرت کا مفہوم اور اردو شاعری میں منظر نگاری کی کمی کے اسباب بیان کیے گئے ہیں، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ اردو شعرا نے مناظرِ فطرت کا کن کن حیثیتوں اور پہلوؤں سے ذکر کیا ہے، ہر ایک کی مثالیں بھی دی گئی ہیں، اور ان کے

محاسن و معائب ظاہر کیے گئے ہیں، اردو میں اس موضوع پر یہ پہلی مبسوط کتاب ہے جو محنت اور سلیقہ سے لکھی گئی ہے، لیکن مضامین میں جابجا تکرار ہے اور بعض جزئیات کا اس طرح استقصا کیا گیا ہے کہ طبیعت گھبرا جاتی ہے، اردو شاعری میں منظر نگاری کی کمی کا مصنف نے کئی جگہ شکوہ کیا ہے، اور ایک باب میں اس کے اسباب بھی لکھے ہیں، دورِ قدیم میں خصوصاً غزلیہ شاعری کی حد تک تو اسکو درست مانا جا سکتا ہے، لیکن نظموں اور بعض دوسرے اصنافِ سخن خصوصاً جدید شاعری کے بارہ میں یہ شکوہ بیجا ہے، البتہ انگریزی اور سنسکرت کی شاعری کے مقابلہ میں اردو شاعری میں منظر نگاری کی کمی بھی ہے، اور اس کا معیار بھی پست ہے، اس سے قطع نظر یہ کتاب اپنے موضوع پر بڑی جامع ہے۔

دیوانِ شاہ نیاز بریلوی۔ مرتبہ ڈاکٹر انوار الحسن صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۴۴، مجلد، قیمت تحریر نہیں، پتہ: راجہ رام کمار بکڈپو وارث مطبع منشی نولکشور، لکھنؤ۔

مشہور صوفی بزرگ حضرت شاہ نیاز احمد بریلوی (م ۱۲۵۰ھ) صاحبِ کمال شاعر تھے، اردو، فارسی، عربی اور ہندی چاروں زبانوں میں دادِ سخنوری دیتے تھے، ان کے بہت سے اشعار زبان زد ہیں، اور عرس و قوالی کی محفلوں کو گرم کرتے ہیں، اردو اور فارسی دیوان کئی بار چھپنے کے باوجود کمیاب تھے، لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی کے لائق استاد ڈاکٹر انوار الحسن نے اس کو مختلف مجموعوں اور نسخوں سے مقابلہ و تصحیح کے بعد شائع کیا ہے، اس کا بڑا حصہ فارسی اور اردو کلام پر مشتمل ہے، آخر میں ہندی کلام کا بھی مختصر نمونہ ہے، غزلیات کے علاوہ قصائد، نعت و منقبت، مناجات، مثنویات و مستزاد وغیرہ بھی ہیں، مقدمہ میں مرتب کے قلم سے صاحبِ دیوان کے حالات اور شاعری پر مفصل تبصرہ ہے، تصحیح میں بعض فروگذاشتیں رہ گئی ہیں، مرتب نے ان کی کل نو تصنیفات کا ذکر کیا ہے، مگر مسعود حسین صاحب نظامی کے مضمون "تصانیفِ حضرت شاہ نیاز بے نیاز بریلوی" (مطبوعہ معارف مئی ۱۹۶۶ء)

میں سترہ تصنیفات کا ذکر ہے، حضرت شاہ نیاز کا کلام مختصر ہونے کے باوجود منتخب سوز و گداز سے معمور اور عشق حقیقی کا صحیفہ ہے اور اس حیثیت سے اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے۔

کعبؓ بن زُہیر اور قصیدۂ بانت سعاد، مرتبہ و مترجمہ جناب علی محسن صدیقی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۰۴، قیمت عکم پیسے، ناشر مکتبہ اسحاقیہ جونا مارکیٹ، بھول چوک، کراچی۔

حضرت کعبؓ، مشہور جاہلی شاعر زہیر بن ابی سلمیٰ کے فرزند اور اپنے دور کے نامور شاعر تھے، ان کا سب سے مشہور و مقبول قصیدہ "بانت سعاد" ہے، جو اپنی ادبی حیثیت کی بنا پر عربی مدارس کے نصاب میں داخل ہے، کعبؓ اسلام لانے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کیا کرتے تھے، قبول اسلام کے بعد اس کی معذرت اور تلافی کے لیے ایک قصیدہ لکھکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا، آپ نے اس کو پسند فرمایا، اور اس کے ایک شعر پر اپنی ردائے مبارک مرحمت فرمائی، اسی کی نسبت سے وہ قصیدہ بردہ مشہور ہے، یہ قصیدہ بار بار چھپ چکا ہے، اب جناب محسن صدیقی استاد تاریخ کراچی یونیورسٹی نے کئی نسخوں کی مدد سے اس کا صحیح متن مطلیں اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، اور اس کے لغات کی تشریح اور نسخوں کے اختلاف کا بھی ذکر کیا ہے، شروع میں حضرت کعبؓ کے حالات، ان کی شاعری اور اس قصیدہ کی خصوصیات پر تبصرہ اور اس کی مختلف شرحوں اور دوسری زبانوں کے ترجموں کا ذکر کیا ہے، فٹ نوٹ میں متعدد جاہلی اور مخضرمین شعراء کے مختصر حالات بھی آگئے ہیں، صلح حدیبیہ کا سنہ دو جگہ ۸ھ لکھا گیا ہے، جو غلط ہے۔

"ض"

جلد ۱۰۵　ماہ ذوقعدہ و ذوالحجہ ۱۳۸۹ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۷۰ء　عدد ۲

مضامین